ناول

شب انتظار گزری ہے

ڈاکٹر انوار الحق

ترجمہ

وسیم احمد علیمی

شب انتظار گزری ہے

(ناول)

ڈاکٹر انوار الحق

ترجمہ

وسیم احمد علیمی

ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی

© جملہ حقوق بحقِ مترجم محفوظ

''اردو ڈائرکٹوریٹ''، محکمہ کابینہ سکریٹریٹ، حکومت بہار کی مالی معاونت سے شائع کیا گیا''

SHABE INTEZAR GUZRI HAI
(Novel)
by
DR ANWARUL HAQUE
Translated by
WASIM AHMAD ALIMI

Year of Edition 2018
ISBN 978-93-88356-37-4
₹ 200/-

نام کتاب	:	شب انتظار گزری ہے
مصنف وناشر	:	ڈاکٹر انوار الحق
ترجمہ	:	وسیم احمد علیمی
سنِ اشاعت	:	۲۰۱۸ء
قیمت	:	۲۰۰ روپے
تعداد	:	۵۰۰
مطبع	:	روشان پرنٹرس، دہلی۔٦

EDUCATIONAL PUBLISHING HOUSE
3191,Vakil Street, Kucha Pandit, Lal Kuan, Delhi-6(INDIA)
Ph : 23216162, 23214465, Fax : 0091-11-23211540
E-mail: info@ephbooks.com,ephindia@gmail.com
website: www.ephbooks.com

انتساب

آج کے نام
اور آج کے غم کے نام
آج کا غم کہ ہے زندگی کے بھرے گلستاں سے خفا
زرد پتوں کا بن
زرد پتوں کا بن جو مرا دیس ہے
درد کی انجمن جو مرا دیس ہے

(فیض)

تم آئے ہو نہ شب انتظار گزری ہے
تلاش میں ہے سحر بار بار گزری ہے

(فیض)

فہرست

عرض مترجم	17
پہلا باب	25
دوسرا باب	38
تیسرا باب	45
چوتھا باب	49
پانچواں باب	56
چھٹا باب	62
ساتواں باب	67
آٹھواں باب	73
نواں باب	86
دسواں باب	97
گیارھواں باب	103
بارھواں باب	118
تیرھواں باب	128
چودھواں باب	135

پندرہواں باب	142
سولہواں باب	153
سترہواں باب	157
اٹھارہواں باب	162
انیسواں باب	165
بیسواں باب	173
اکیسواں باب	178
آخری باب	185

ہوگی اس ڈھیر عمارت میں کہانی کچھ تو
ڈھونڈ الفاظ کے ملبے میں معانی کچھ تو

شہپر رسول

The mountains, trees and rivers change their appearance with the vicissitudes of time and seasons, as a man changes with his experiences and emotions. The lofty poplar that resembles a bride in the daytime, will look like a column of smoke in the evening; the huge rock that stands ipregnable at noon, will appear to be a miserable pauper at night, with earth for his bed and the sky for his cover; and the rivulet that we see glitthering in the morning and hear singing the hymn of eternity, will, in the evening, turn to a stream of tears wailing like a mother bereft of her child.

(THE BROKEN WINGS BY KAHLIL GIBRAN)

پہاڑ، دریا، درخت سب کے سب وقت اور موسم کے نشیب وفراز کے ہمراہ اپنے کو بدل دیتے ہیں جس طرح ایک انسان اپنے تجربات اور احساسات وجذبات کے ساتھ بدل جاتا ہے، بلند و پر وقار درخت حور جودن میں ایک دلہن سے مشابہت رکھتا ہے بوقت شام دھوئیں کے ایک ستون کی طرح دکھائی دیتا ہے، بلند چٹان جو بوقت نصف النہار نا قابل تسخیر حالات میں ایستادہ ہوتی ہے راتوں میں قابل رحم مفلس کی طرح دیکھائی دیتی ہے جس کا بچھونا زمین ہے اور آسمان جس کا سائبان۔ دریا جسے صبح کو درخشاں اور نغمۂ ابدیت الاپتے ہوئے دیکھتے ہیں بوقت شام اپنے بچے سے محروم کی گئی اور آہ و بکا کرتی ہوئی ایک ماں کی طرح آنسوؤں کے جھرنے میں تبدیل ہو جاتا ہے۔

(خلیل جبران۔ شکستہ پر۔ ترجمہ۔ کوثر مظہری)

یہ جو دنیا کے بارے میں اتنی من گڑھت کہانیاں سنائی جاتی رہتی ہیں، ان کی حقیقت کچھ بھی نہیں۔ یہاں موجود انسانوں کی بھیڑ، ان کا جم غفیر، رشتے، طبقاتی کشمکش، سماجی ناانصافیاں، جنگ و جدل، محبتیں، نفرتیں، دہشت گردیاں، سیاسی اور معاشی بے ہمواریاں اور نہ جانے کیا کیا الم غلم، یہ سب ازل سے ویران کرۂ ارض پر کسی دوسرے سیارے کے انسانوں کے دیکھے گئے خواب ہیں، یہ اس دنیاں میں لٹکتی ہوئی الٹی تصویریں ہیں۔

(خالد جاوید۔ موت کی کتاب)

یہ سراسر ناانصافی ہے۔ اوراس طرح کی ناانصافیوں سے دنیا بھری پڑی ہے۔شارق کی والدہ کے ساتھ جو ہوا وہ بھی ناانصافی تھی۔شارق کو تین سالوں تک قید و بند کی صعوبتیں اور پھر فرضی انکاؤنٹر میں موت بھی کوئی انصاف والی بات نہ تھی۔ دنیا سے انصاف عنقا ہو چکا ہے۔آخر اس کی بنیاد اور جڑ کیا ہے؟ دنیا میں ہر طرف نفرت، حسد اور ظلم و جبر کا بول بالا ہے اور ان سب کے شکار صرف بے گناہ لوگ ہیں۔

(اسی ناول سے)

عرضِ مترجم

میں نے ترجمہ کے لیے ناول ''Long Wait'' کا انتخاب کیوں کیا؟ اس ناول میں وہ کون سی کششِ ثقل تھی جس نے مجھے اس کو اردو میں منتقل کرنے کی تحریک دی؟ ترجمہ ہی کرنا تھا تو کسی ایسے فن پارے کا انتخاب کرتے جس کی اہمیت مسلّم ہو یا اگر وہ فن پارہ پردۂ گم نامی میں ہو تو اس قابل ضرور ہو کہ ترجمہ کا جوڑا زیب تن کرتے ہی قارئین کی دل چسپی کا سامان بن سکے۔ان سوالوں کا کوئی تشفی بخش جواب تو میرے پاس نہیں تاہم اتنا یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ ڈاکٹر انوار الحق کے اس انگریزی ناول کا ترجمہ اگر میں نہیں بھی کرتا تب بھی یہ کتاب اردو کا جامہ پہن ہی لیتی۔ میرے اس ایقان کی وجہ یہ ہے کہ بنیادی طور پر اس ناول کی زبان تو انگریزی ہے مگر اس کے مطالعے سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ اس کے مشمولات کو تخلیقی عمل سے گزارنے میں اردو کا ہی سہارا لیا گیا ہے۔ کہانی کی بُنت ہی اس بات کی دلیل ہے کہ تخلیق کار نے سوچا اردو میں اور لکھا انگریزی میں ہے۔ یہاں تک کہ کرداروں کے نام، مکالمے، کہانی کا جائے قوع، بیانیہ کا انداز اور زمان و مکان سب کچھ اردو تہذیب کی عکاسی کرتے معلوم ہوتے ہیں۔ آپ یوں سمجھیے کہ یہ ناول انگریزی میں ایسے ہی ہے جیسے کوئی روایت پسند، پاسدارِ تہذیب و تمدن خالص ہندوستانی نوجوان وقتی طور پر ٹائی اور سوٹ

بوٹ پہن کر مغرب کی وادیوں میں سیر کر رہا ہے جس کو آج نہ کل گھر واپسی کرنی ہی ہے۔

کلُّ شیٍ یرجعُ اِلیٰ اصلہ (ہر چیز اپنی اصل کی طرف لوٹتی ہے)

خود ناول کے مصنف ڈاکٹر انوار الحق نے ایک انٹرویو میں اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ کسی بھی زبان میں ادب تخلیق کرنے کے لیے ضروری ہے کہ ادیب اسی زبان میں خواب دیکھنے کا اہل ہو اور اس میں شک نہیں ڈاکٹر انوار الحق جس شفافیت کے ساتھ اردو زبان میں خواب دیکھ سکتے ہیں انگریزی زبان میں نہیں دیکھ سکتے۔ اس تمہید کے بعد مجھے یہ اعتراف کرنے میں ذرا بھی تامل نہیں کہ میں نے ''Long Wait'' کا اردو میں ترجمہ نہیں کیا بلکہ ایک ایسے اردو ناول کو اردو ہی میں منتقل کر دیا جو کسی خاص مقصد کے تحت انگریزی میں تحریر کر دیا گیا تھا۔

ناول کی ادبی حیثیت کیا ہے، ادب کے میزان پر کھرا اترتا ہے یا نہیں، فن اور تکنیک کی سطح پر اس کا مقام و مرتبہ کتنا بلند یا پست ہے ان اصولی بحثوں کی گتھی سلجھانا نہ میرا کام ہے اور نہ میرے اندر اس کی جسارت۔ کسی بھی متن کی قدر و منزلت کا تعین اس فن کے ماہرین ہی کر سکتے ہیں۔ انگریزی نسخے پر تو دنیا بھر کے قارئین نے جی کھول کر تبصرہ لکھا ہے اب ترجمہ کا چولا پہن کر یہ کتاب اردو فکشن کے ناقدین اور قارئین کی طرف داد طلب نظروں سے دیکھ رہی ہے۔ ناول کے داخلی مشمولات کے متعلق اپنے ناتجربہ کار قلم کی بھدی روشنائی کو گورے چٹے کاغذ پر انڈیلنے سے بہتر ہے کہ کسی کے مختصر اور جامع تبصرہ کو یہاں چسپاں کر دوں۔ اصل کتاب پر ایک معتبر انگریزی اخبار نے تبصرہ شائع کیا تھا:

''کہانی ایک ایسی معذور لڑکی کے گرد گردش کر رہی ہے جو ایک کامیاب بیٹی، بیوی، اور بہو ہونے کے باوجود سماجی تعصب سے دوچار ہے، اس کی خودی بے مثال ہے مگر اس کو اپنی حرمت بحال رکھنے کے لیے بے شمار مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے، اس کے بدلتے ہوئے سپنے آخر تک ادھورے رہ جاتے ہیں، دل

چسپ یہ ہے کہ اس لڑکی کے اندر چھپی ہوئی مدر ٹریزا بھی ہے۔اس ناول میں ہندوستانی دیہی زندگی کی ایک ان کہی حقیقت کا سراغ بھی مل جاتا ہے جہاں عورتیں خاندان کی سالمیت میں کلیدی کردار ادا کرتی ہیں۔اس ناول نے خاندانی شیرازہ بندی میں خواتین کے کردار کو خوب اجاگر کیا ہے تاہم یہ گوشہ تشنہ رہ جاتا ہے کہ اس سلسلے میں ان عورتوں کو کن خارزار وادیوں سے گزرنا پڑتا ہے۔کتنے افسوس کی بات ہے کہ ایسی عورتیں آزادی تو کیا حریت نسواں کے مباحث کا حصہ تک بننے سے رہ جاتی ہیں۔مختصر یہ کہ کتاب دیہاتی زندگی کی عکاس ہے جہاں ہیلتھ کیئر سے لے کر پولیس فورس تک اور مذہبی اداروں سے لے کر اسمبلی تک ہر طبقۂ حیات چند گنے چنے سر برآوردہ لوگوں کے قبضے میں ہے"۔

(دی اسٹیٹس مین، 17 جولائی، 2014)

ساہتیہ اکادمی انعام یافتہ نیپالی زبان کے خوش اسلوب شاعر من پرساد سبا نے اپنے مطالعے کا ماحصل اور نچوڑ ان لفظوں میں بیان کیا ہے:

"کہانی میں واقعات ابتدا سے اختتام تک خط مستقیم پر بڑھتے چلے گئے ہیں، کہانی میں پلاٹ بھی اپنا دائرہ بنائے ہوئے ہے، کبھی کبھی خاندانی لڑائی کا نتیجہ دو قوتوں کی شکل میں نمودار ہوتا ہے ایک کی نیت میں خیر ہوتا ہے تو دوسری طرف شیطانیت، دو طاقتیں ہمیشہ ستیزہ کار رہتی ہیں، جدید اور مابعد جدید ناولوں کے بر خلاف کہانی کے کرداروں کو دو مقابل طاقتوں میں بانٹ دیا گیا ہے۔آپ کے ناول میں سادہ لوح عوام کے درمیان فرقہ وارانہ ہم آہنگی کا بھی پیغام ہے ایسے لوگ جن کو سیاست سے کوئی سروکار نہیں ہوتا ایسی سیاست جو اپنے ناپاک ارادوں کے لیے فرقہ وارانہ جذبات کو برانگیخت کرتی ہے۔آپ غریب اور ناخواندہ طبقات میں پھیلے ہوئے روایتی نظریات کے تاریک پہلوؤں کو اجاگر کرنے میں بھی کامیاب ہوئے ہیں۔جس کی ایک مثال تعلیم نسواں کا مسئلہ بھی ہے"۔

یہ سچ ہے کہ گاؤں کا جو منظر نامہ اس طرح کی کہانیوں میں بیان ہونا چاہیے ڈاکٹر انوار الحق نے ویسا ہی بیان کیا ہے دیہی زندگی کی تصویر بنانے میں انہوں نے جتنی جانفشانی کی ہے قارئین کے تاثرات دیکھ کر لگتا ہے ان کی محنت رائیگاں نہیں گئی ہے۔ایک قاری نے لکھا ہے:

''میں اس ناول کی کہانی کے تعلق سے کش مکش میں تھی کیوں کہ مجھے معلوم تھا کہ ناول نگار ڈاکٹر انوارالحق نے ڈاکٹریٹ کی ڈگری اردو میں حاصل کی ہے اس کے باوجود وہ سلیس انگریزی بولتے اور لکھتے ہیں لہذا یہ بات طے تھی کہ اس ناول میں مجھے اپنی تہذیب وتمدن سے پرے ایک دوسری تہذیب کی جھلکیاں نظر آئیں گی۔ کہانی دیہی ہندوستان کی ایک معذور خاتون کی ہے اور نہایت دل چسپ ہے وہ ایک معذور مسلم عورت ہے جو زندگی سے جنگ لڑتی ہے اور اپنا سب کچھ قربان کر دیتی ہے''۔

(شیلمی، کیلیفونیا، امریکہ)

مادیت پرستی کے رجحان نے نہ صرف محلوں کی زندگی کو متاثر کیا ہے بلکہ مٹی سے جڑے ہوئے لوگ بھی اس کے برے نتائج کی زد میں ہیں۔ ناول کے پہلے ہی باب میں جہاں کم سن لڑکی رانی ظالم دنیا کے مصائب سے بے خبر اپنی سہیلیوں کے ساتھ کھیل میں میں مصروف رہتی ہے اور ایک آوارہ لڑکا وہاں جا کر ایک جانکاہ خبر سناتا ہے کہ چند پولیس والے اس کے بے قصور والد کو گرفتار کر کے لے گئے۔ وہ لڑکی کھیل چھوڑ کر گھر کی طرف دوڑتی ہے۔ گھر جا کر معلوم ہوتا ہے کہ یہ سب کچھ اس کے سگے چچا کی کارستانی کا نتیجہ ہے تو اس معصوم سی بچی پر بھی دنیا کی سنگینیوں کا بھید کھلنے لگتا ہے۔ مادیت پرستی کے نتیجے میں پیدا ہونے والی تلخیوں کا یہ سلسلہ آخری باب تک محیط ہے جہاں رانی کا شوہر دہلی میں مقیم اپنے بیٹے انس سے فون پر بات کرنا بھی گوارہ نہیں کرتا زندگی کے انہیں گہرے بھدے نقوش کو ایک اور قاری نے یوں سمجھنے کی کوشش کی ہے:

''ناول نگار کا یہ کارنامہ نہایت عظیم ہے کہ انہوں نے اس ناول میں ہندوستانی سماج کے متعدد مسائل کی نشاندہی کرنے کے ساتھ ساتھ ان کا حل بھی تلاش کرنے کی کوشش کی ہے۔ ناول میں قدیم و جدید ہندوستان کے سماجی، تہذیبی، اقتصادی اور سیاسی پہلوؤں کی واضح تصویر دکھائی گئی ہے۔ کبھی کبھی مادی قوت پاکیزہ رشتوں کو بھی کچل دیتی ہے۔ ناول میں کتنے ایسے حالات کا بیان ہے جو ہمیں غربت کے نتیجے میں پیدا ہونے مسائل سے روشناس کراتے ہیں اور یہ کہ نامساعد حالات میں کس طرح آپ کے اپنے

قرابت دار آپ کا استحصال کرتے ہیں۔ڈاکٹر انوارالحق جو اردو زبان وادب کے ماہر ہیں ان کی یہ عظیم تخلیق حقیقت کی بھرپور عکاسی کرتی ہے''۔

(نازیہ بیگم جافو،مہاتما گاندھی انسٹیٹیوٹ،موکا،ماریشش)

معروف صحافی سہیل انجم نے بھی نہایت خوب صورت پیرایے میں اظہار خیال کیا ہے۔وہ لکھتے ہیں

''رانی کے والد اپنے بھائی سے جائیداد کی لڑائی لڑتے ہیں جس میں دونوں بھائیوں کا گھر بار لٹ جاتا ہے اور پھر بعد میں تمام رنجشوں کو بھلا کر باہم شیر وشکر ہو جاتے ہیں۔اس طرح کے واقعات ہندوستانی تہذیب وثقافت کا حصہ ہیں اور اس ناول کی عمارت انہیں واقعات وحالات پر کھڑی کی گئی ہے۔ناول کے اختتام کی تکنیک مکمل بھی ہے اور دل چسپ بھی۔۔۔۔۔۔۔۔ڈاکٹر حق اس ناول کے ذریعے جو پیغام دینا چاہتے ہیں وہ اس میں کامیاب ثابت ہوئے ہیں۔میں امید کرتا ہوں کہ مستقبل میں ان کے قلم سے مختلف سماجی مسائل پر دیگر کہانیاں منصۂ شہود پر آئیں گی''۔

ترجمے کا مسودہ تو میں نے بی اے کے دنوں میں ہی مکمل کر لیا تھا مگر چند مجبوریوں کی وجہ سے اشاعت میں غیر معمولی تاخیر ہوئی تاخیر کا ایک فائدہ یہ ہوا کہ اس دورانیے میں یہ کتاب کئی مستند شخصیات کی نظر سے گزری۔چونکہ میں ابھی سیکھنے کے مرحلے سے گزر رہا ہوں اس لیے اس ترجمہ کو اسی نظر سے ٹٹولنا چاہیے۔اس سلسلے کی ایک دل چسپ داستان یہ ہے کہ میں نے ترجمہ پہلے کیا اور بعد میں جامعہ ملیہ اسلامیہ کے شعبۂ انگریزی سے ترجمہ نگاری کا باضابطہ ایک سالہ کورس مکمل کیا۔یعنی ترجمہ پہلے کیا اور ترجمہ نگاری کے اسرار ورموز بعد میں سیکھے لیکن یہ کام کرنے سے پہلے بھی میں او۔ہنری کے چند افسانے اور مشہور ماہر تعلیم ،سیاسی رہنما ،مفکر اور امریکی مصنف بوکر ٹی واشنگٹن کی خودنوشت سوانح حیات سے کچھ حصہ ترجمہ کر کے شائع کروا چکا تھا،انہیں ترجموں کے ردعمل کے طور پر اساتذہ اور دوست واحباب کی حوصلہ افزائیاں میرے اس ترجمے کی محرک بنیں۔

ناول کے مصنف ڈاکٹر انوار الحق نے مرکزی یونیورسٹی جامعہ ملیہ اسلامیہ کے شعبۂ اردو سے ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی مگر صرف اردو تک محدود نہیں رہے ان کا قلم یکساں روانی کے ساتھ انگریزی اور اردو دونوں زبانوں میں چل رہا ہے۔ انگریزی زبان میں ان کا یہ پہلا ناول ہے۔ اس کے علاوہ "Wordsmiths: Shaping Literature" کے عنوان سے وہ مختلف زبانوں کے مشاہیر ادبا و شعرا کے شخصی خاکے لکھ رہے ہیں جن کی تعداد اب تک اٹھارہ سے تجاوز کر چکی ہے۔ ان کا یہ اقدام سوشل میڈیا پر خوب مقبول ہوا ہے۔ اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ان کا قلم اردو میں تیز گام نہیں ہے۔ ان کی اردو کتابیں 'قرۃ العین حیدر کی غیر افسانوی نثر' چاندی بیگم: ایک جائزہ' اور مضامین کا مجموعہ 'فکشن تجزیہ اور موہوم حقیقت' ان کی کثیر الجہات شخصیت کی منہ بولتی تصویریں ہیں۔ میں ان کا بے حد ممنون ہوں کہ انہوں نے مجھے ترجمے کی اجازت دی اور اس پورے سفر میں ہر ہر لغزش پر ایک کامل رہبر کی طرح میرا ہاتھ تھامے رہے۔ ان کی خوش بختی پر نئے تخلیق کاروں کو ضرور رشک آتا ہوگا (اگر نہ آئے تو آنا چاہیے) کہ ان کا پہلا تخلیقی سرمایہ دو مختلف زبانوں میں ترجمہ ہو چکا ہے۔ جناب پرشانت پٹنا یک نے اس ناول کو اڑیہ زبان میں منتقل کرنے کا فریضہ انجام دیا ہے۔ اڑیہ کے قارئین کا ردعمل کیسا رہا مجھے نہیں معلوم مگر آپ کا ردعمل جاننے کے لیے بے حد بے تاب ہوں۔

سخت ناسپاسی ہوگی اگر اس مقام پر میں حکومت بہار اور محکمہ کابینہ سکریٹریٹ اردو ڈائرکٹوریٹ کا شکریہ ادا نہ کروں کیوں کہ اس ادارے کے مالی تعاون کے بغیر یہ کتاب نہ جانے اور کب تک انتظار کے شب و روز گزارتی رہتی۔ رواں صدی کے مایۂ ناز فکشن نگار مشرف عالم ذوقی صاحب نے اس ترجمہ کے لیے ایک نہایت خوب صورت اور اسم بامسمی عنوان تجویز کر کے مجھے فریضۂ احسان مندی میں مبتلا کر دیا ہے سو ان کا بھی بے حد ممنون و

مشکور ہوں۔ ساتھ ہی ساتھ میں شعبۂ اردو جامعہ ملیہ اسلامیہ کے تمام اساتذہ کا بے حد احسان مند ہوں کہ یہ کام انہیں کی تربیت کا ثمرہ ہے۔ خصوصا استاد محترم ڈاکٹر سید تنویر حسین کا پرخلوص شکریہ کہ انہوں نے صرف زبانی ہی نہیں تحریری شکل میں بھی میری ہمت افزائی کی۔ ان تمام احباب کا بھی بے حد مشکور ہوں جو ہر محاذ پر اپنے مفید مشوروں سے نوازتے رہے ہیں۔

اور ہاں! چلتے چلتے ایک راز کی بات بتادوں۔ جس کے لیے میں نے "Long Wait" کے ایک ایک جملے کو اردو کے سانچے میں ڈھالا تھا وہ تو اب زندگی کی ہر مصیبت جھیل کر خاموش ہو چکی ہے۔ زبان سلامت ہے مگر اس کے پھیپھڑوں سے آنے والی ہوا میں اتنی قوت نہیں رہی کہ کوئی آواز پیدا کر سکے۔ اس کے وہ ہاتھ جو کبھی رات کی تنہائی میں میرے روشن مستقبل کی دعا کے لیے اٹھا کرتے تھے اب ان میں اتنی بھی جنبش نہیں کہ اپنا ہی نوالہ اپنے منہ تک لے جائے۔ ہاں انگلیاں کبھی کبھی مسلسل حرکت میں ہوتی ہیں۔ والد صاحب کہتے ہیں انگلیوں کی یہ حرکت اس بے آواز تسبیح کو شمار کرنے کے لیے ہے جو اس کے کپکپاتے ہونٹوں پر جاری ہے۔ عمرِ رفتہ نے اس کو کبھی چین سے بیٹھنے نہیں دیا مگر اب وہ بیمار اور لاغر جسم ویل چیئر پر ہی سہی بڑے آرام سے متمکن ہوتا ہے۔ وہ پائپ جو ڈاکٹر ہر پندرہ دن پر اس کی ناک کے راستے بھوک کی تھیلی تک ڈال جاتا ہے ڈاکٹر کے لیے وہ دوا اور غذا رسائی کا ایک ذریعہ ہو سکتی ہے میری نظر میں تو وہ ایک لازوال زیور ہے۔ سر پر گھنے بالوں کے بیچ وہ سرجری کا نشان کتنا خوش نما لگتا ہے جیسے کسی نے کمال مشاطگی سے مانگ نکال دی ہو۔ اس کی سانس تو آج بھی اسی گرماہٹ کے ساتھ آنا جانا کر رہی ہے مگر قدرت نے اس کے پورے وجود کو بُت اور میرے تمام افراد خانہ کو بت پرست بنا کر رکھ دیا ہے۔ 2 نومبر 2016 کی دوپہر وقت نے میرے اس ترجمہ کی پہلی قاری کو ایسا پٹخا کہ پھر سنبھلنے کا موقع

نہیں دیا۔ آج بستر پر اس کا ایک ایک پل کسی بڑے معجزہ کے انتظار میں ہے۔ جہاں کی نظر میں وہ ایک مریض ہے میری نظر میں وہ ایک جہان ہے، وہ میری ماں ہے، اور اسی وجہ سے یہ ترجمہ میرے لیے کسی مصحف سے کم نہیں کیوں کہ امی نے آخری بار اسی فکشن کو حقیقت کی نظر سے پڑھا تھا اور کہا تھا ''بیٹا! یہ جو اس ناول کی مرکزی کردار رانی ہے نا؟ اس کے مصائب کی داستان اور پیمانۂ صبر و رضا تیری ماں سے ملتے جلتے ہیں''۔

وسیم احمد علیمی

ستمبر، 2018

(شعبۂ اردو، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی)

پہلا باب

ناتواں قدموں سے اپنی چپل پر قابو پانے کی کوشش میں اس نے اپنا توازن کھو دیا۔اس کی چپل پیروں سے آزاد ہو کر نہر میں جا گری جہاں اس کی نگاہیں اس ہچکولے کھاتی چپل کو دیکھ سکتی تھیں ،وہ ایک بے نیاز سی لڑکی تھی ،اس نے اپنی سہیلیوں کی معاونت کے بغیر ہی چپل باہر نکالنے کی کوشش کی ،وہ محض تیرہ سالہ دوشیزہ تھی جس کی ایک ٹانگ لاغر اور چھوٹی تھی اور بچپن ہی میں متعدی مرض پولیو کا ایسا وار ہوا تھا کہ وہ بہ مشکل ہی اپنی گردن کو حرکت دے سکتی تھی۔

اس کو یہ قطعی پسند نہ تھا کہ دوسرے لوگ اس کی مدد کریں ،ہاں !مگر جب کوئی چارہ نہ ہو۔یہ ایک نئی اور گلابی رنگ کی چپل تھی جو اس کے ابا نے اسی صبح اس کو دلوائی تھی۔اس سے کم دام کی چپل اس کے ابا کو نہ مل سکی تھی۔یہ چپل سب سے سستی تھی تاہم اس کو بہت پسند تھی اور اس کے دل میں کوئی ملال نہ تھا۔اپنی پوری کوشش کے باوجود وہ نہر میں سے اپنی چپل نہ نکال سکی۔ یہ نہر تقریباً نصف میل کی مسافت پر اس کے گاؤں کے عقب میں تھی۔ عموماً چار پانچ لڑکیاں ہر شام وہاں باندھ پر ''کِٹ کِٹ'' کھیلنے جایا کرتیں ،جب ایک لڑکی نے اس کو نہر کی جانب لڑکھڑاتے ہوئے دیکھا تو دوسری لڑکیوں کے ہمراہ شور مچاتی ہوئی اس کی طرف لپکی ایک نے اس کو کھینچ کر باندھ پر لا کھڑا کیا دوسری وہیں پڑی ایک لکڑی کی

مدد سے اس کی گلابی چپل کو باہر لے آئی اس کی سہیلی کے ہاتھوں میں چپل دیکھ کر اس کا چہرہ خوشی سے کِھل اٹھا۔

''ارے رانی! تو تو محض ایک ادنیٰ سی چپل کے لیے اپنی جندگی قربان کرنے چلی تھی'' اس کی ایک سہیلی جس کے پیروں میں نفیس چپل تھی تبصرہ کرتے ہوئے بولی۔

رانی قدرے تامل کے بعد بولی

''میرے چھوٹے بھائی کی چپلیں تم سے اچھی ہیں''۔

''میں نے تمہاری چپل پر عیب نہیں لگایا سمجھی! میرا مطلب تو یہ تھا کہ چپل تیری جندگی سے اہم نہیں ہے، کیا تجھے ڈوب جانے کا خطرہ محسوس نہیں ہوا؟'' اس نے قدرے غصے سے جواب دیا۔

رانی کو ہلکی سی ندامت محسوس ہوئی کیونکہ اس بات سے وہ بھی آگاہ تھی کہ اس کی سہیلیوں نے اس کی جان بچائی ہے۔ بارے دیگر وہ سب کھیل میں لگ گئیں، تبھی ایک ہم سن لڑکا دوڑتا ہوا آیا، سانسیں لی اور سیدھا کھڑا ہو گیا، وہ ننگے پاؤں تھا۔ بغیر چپلوں کے گاؤں کے اندر چکر لگاتے پھرنا اس کے لیے عام بات تھی، وہ پھٹے کپڑے میں ملبوس تھا اور یہ بھی ان جیسے بچوں کے لیے بہت عام سی بات تھی۔

''ارے یہاں کیا کر رہے ہو! گھر جا! جا یہاں سے کھیلنے دے!'' اس لونڈے کے سامنے کھیلنا لڑکیوں کو تھوڑا ناگوار سا لگا۔

''رانی! تو یہاں اپنی ہم جولیوں کے ساتھ کھیل کے مزے لے رہی ہے اور ادھر چند پولیس والے تیرے ابا کو گرفتار کر کے جیل لے گئے'' اس لڑکے نے اطلاع دی۔

یہ حیرت انگیز خبر سن کر رانی اور اس کی سہیلیاں سناٹے میں آ گئیں اور گاؤں کی

جانب دوڑ پڑیں۔ گاؤں پہنچ کر انہوں نے دیکھا کہ اس کے گھر پہ لوگوں کا میلہ لگا ہوا ہے اور سب ایک دوسرے سے باتیں کر رہے ہیں۔ اس کی اماں بھائیوں کے ساتھ گریہ وزاری کر رہی ہے بلکہ اس کے چچا پر ملامت بھیج رہی ہے جو فاتحانہ شان کے ساتھ فخر سے سینہ پھلائے ہوئے دروازے کے سامنے چار پانچ لوگوں کے حلقے میں محوِ گفتگو تھا۔ رانی اتنی سیانی نہیں تھی کہ ساری چیزیں سمجھ سکتیں۔

جو لوگ رانی کے گھر کے اندر جمع تھے وہ اس کے ابا کو جیل سے رہائی دلانے کا طریقِ عمل تجویز کر رہے تھے۔ وہ کوئی پاپی نہیں تھا بلکہ یہ اس کے خلاف ایک سازش کا نتیجہ تھا۔ محض دو گھنٹے گزرے تھے کہ ایک موٹر سائیکل سوار پولیس افسر رانی کی والدہ سے ملنے آیا۔

''حامد کی جورو کہاں ہے؟ مجھے ابھی فوراً اس سے بات چیت کرنی ہے'' پولیس افسر اپنی مونچھوں کو تاؤ دیتے ہوئے چلایا۔ اس نے اپنی گاڑی لگائی اور نیم کے درخت کے سایے میں کھڑا ہو گیا، اس کے آنے کی خبر سن کر گاؤں کے تمام لوگ اس کے گرد جمع ہو گئے۔ ایک ننھا سا لڑکا دوڑے ہوئے کرسی لے کر آیا۔ ایک بزرگ نے اپنے تولیہ سے کرسی صاف کی اور پولیس افسر کا دربار لگ گیا۔ حامد کی بیوی اپنی آنچل سے آدھا چہرہ ڈھکے ہوئے روتی ہوئی وہاں پہنچی۔

''صاحب! میرے مالک کو بچا لیجئے، وہ بے گناہ ہے، اس کو پھنسایا گیا ہے، ہم پہ آپ کا بڑا احسان ہوگا، ہمارے چھوٹے چھوٹے بچے ہیں.....''

وہ اپنی بھرائی ہوئی آواز میں اتنا ہی کہہ سکی اور پھر رونے لگی۔ جب وہ سینہ کوبی کرنے لگی تو دوسری عورتوں نے اسے سنبھالا دیا۔ ''یہ سب ڈرامے بند کرو'' لوگوں کا چہرہ پڑھتے ہوئے افسر نے کہا ''اَبے او لال قمیص! ہاں! تجھی سے کہہ رہا ہوں'' اس نے اپنی آنکھیں چمکائی تا کہ لگے کہ وہ بہت طیش میں ہے۔ لوگوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھ

کرسرگوشیاں شروع کر دیں۔ وہ قمیص والا آدمی ڈرے دھمکے آگے آیا۔

''کیا ہوا صاحب؟'' وہ بہت گھبرایا ہوا تھا۔''ادھر آ'' افسر نے اسے جھڑک کر کہا۔ جیسے ہی وہ قریب پہنچا۔ افسر نے کھڑے ہو کر اسے ایک تھپڑ دے مارا۔

''آنے میں اتنی تاخیر کیوں لگائی؟'' اس نے بھڑک کر پوچھا۔

پھر اس نے سختی سے پوچھ تاچھ کی اور لال قمیص والے سے کہا'' جا ایک گلاس پانی لے کر آ!'' ''جی صاحب!'' اس نے کہا اور تعمیل حکم کے لیے دوڑا۔ اس سانحہ کے بعد لوگ بالکل خاموش ہو گئے۔ سرگوشیاں تک بند ہو گئیں۔ افسر دوبارہ کرسی پر ایسے بیٹھا جیسے کہ مغل شہنشاہ اکبر کسی کو سزائے موت یا کٹھور فیصلہ سنا کر بیٹھا ہو۔ ''تمہارے پتی کے خلاف ایک بہت ہی سخت مقدمہ دائر کیا گیا ہے سمجھی! اسے پانچ سال کی سزا ہو سکتی ہے بلکہ دس سال کی بھی سمجھو ہے۔ مجھے بھی نہیں معلوم کیونکہ یہ عدالت کا معاملہ ہے، ذرا سوچو اس کے بنا تمہارے جیون کا کیا حال ہوگا'' افسر نے اس کو مشورہ دیتے ہوئے کہا۔

''کیس ابھی میرے ہاتھ میں ہے مگر ایک بار میرے ہاتھ سے چلا گیا تو پھر میں بھی کچھ نہیں کر پاؤں گا، سب انسپکٹر بہت سخت ہیں۔ تمہاری خاطر میں انہیں منانے کی کوشش کروں گا۔ لیکن میں یہ سب تمہارے لیے کیوں کروں؟'' افسر نے پہیلی اَن بجھی چھوڑ دی۔

وہ بہت الجھ سی گئی۔ ''صاحب آپ ہی کچھ صلاح دیں میں کیا کروں'' وہ بے صبری سے بولی۔ افسر تھوڑا نرم ہوتے ہوئے بول پڑا'' اگر تم ضد کرتی ہو تو میں کوشش کروں گا مگر اس کے لیے کچھ لینے دینے پڑیں گے، آج کل سرکاری کام کاج بڑا مہنگا ہو چلا ہے، اگر پانچ دن کے اندر اپنے میاں کی واپسی چاہتی ہو تو تمہیں کم سے کم پانچ ہزار دینے پڑیں گے''۔

''پانچ دن! انہیں جلدی واپس لانے کا اور کوئی راستہ نہیں ہے؟''

''ہاں، دیکھتا ہوں، مگر میں وچن نہیں دے سکتا۔ اگر مجھے پیسے دینے کا بھید تم کسی

سے نہیں بتاؤ تو آج رات تک ہی وہ رہا ہو جائے گا'' افسر اس کے کان میں پھسپھسایا۔
''لیکن صاحب میرے پاس تو ایک پھوٹی کوڑی بھی نہیں''
''تو پھر کوئی بات نہیں، میں بھی کچھ نہیں کرسکتا، کل صبح گاڑی اسے ڈسٹک جیل اٹھالے جائے گی پھر انصاف کے لیے کورٹ کا چکر لگاتی رہنا۔ کون جانتا ہے کہ بیچارے حامد کو کب تک جیل کی ہوا کھانی پڑے گی''۔ افسر نے اس کے سامنے حامد کے تاریک مستقبل کا نقشہ کھینچا۔ اس نے افسر کو ذرا رکنے کہا اور گھر کے اندر گئی جہاں چاند میاں پہلے ہی اس کے تاک میں تھا۔ ''کیا ہوا؟'' چاند میاں نے بڑے تجسس سے پوچھا۔

''وہ تو پیسے مانگ رہا ہے''

''تم نے کیا کہا؟''

''اب تک تو کچھ نہیں''

''کیوں؟ تمہیں ہاں کہہ دینا چاہیے تھا''

''مگر میرے پاس پیسے نہیں ہیں''

''کوئی بات نہیں، اگر تمہارے پاس زیور ہیں تو بالکل کم درجے کے سود پر میرے پاس گروی رکھ دو، یاد رکھو کہ اس مشکل کی گھڑی میں تمہارے شوہر سے زیادہ کسی چیز کا مول نہیں''۔ چاند میاں نے مدد کا ہاتھ بڑھایا۔ پھر وہ گھر کے اندر سے زیورات کی ایک چھوٹی سی پوٹلی لے کر آئی اور پولس افسر کے ہاتھ میں تھما کر ایک شکستہ آواز میں اس کا شکریہ ادا کر کے لوٹ گئی۔ افسر کے چہرے پر ایک فریب دہ مسکراہٹ پھیل گئی۔ اس کے بعد چاند میاں بھی نو دو گیارہ ہو گیا۔

اِدھر حامد کے گھر میں معاملہ کشیدہ تھا ادھر مقابل والے دروازے پر حامد کا بڑا بھائی راشد خوب خوش تھا۔ اس رات تقریباً آٹھ بجے افسر نے حامد کو بلا کر رہائی کا حکم دے دیا۔

کسی نے اس کی ضمانت کروادی تھی اور کاغذی کام بھی پورا ہو چکا تھا۔ حامد یہ جاننے کے لیے بے قرار تھا کہ آخر کس نے اس کی مدد کی مگر افسر نے اسے بتادیا کہ وہ کوئی اور نہیں خود اس کی بیوی ہے۔

حامد جب کاغذات پر دستخط سے فارغ ہو کر باہر آ رہا تھا تو اس نے دیکھا کہ چاند میاں پولس افسر کے ساتھ جشن منا رہا تھا۔ ایک وڈ کا شراب کی بوتل ٹیبل پہ رکھی ہوئی تھی۔ ہر کسی کے ہاتھ میں شراب کا پیالہ تھا۔ اسے لگا کہ سب شراب کے نشے میں دھت ہیں۔

ادھر گھر میں رانی کی اماں بہت مضطرب تھی کیونکہ نہ تو اس کا خاوند گھر آیا اور نہ چاند میاں کا کوئی اتا پتا تھا۔

ہر طرف سناٹے کا پہرہ تھا۔ کرسی اب بھی اس گھنے موٹے نیم کے درخت کے نیچے پڑی ہوئی تھی۔ یہ درخت گھپ اندھیری رات میں بھدّا سا لگ رہا تھا اور آشیانوں کے جھرمٹ میں تو جنات کی بستی معلوم ہوتا تھا۔ گاؤں کے ایک سرے پر ایک اتنی پرانی مسجد تھی کہ کسی کو یہ تک معلوم نہ تھا کہ اس کی تعمیر کب ہوئی ہے۔ مسجد کے آگے گاؤں والوں کی آخری منزل یعنی ایک بڑا سا قبرستان تھا۔ آس پاس کے گاؤں تو حکومتِ ہندریز رویشن دستور کے تحت بجلی کی روشنی سے جگمگا رہے تھے۔ بد قسمتی سے یہ گاؤں اس مخصوص زمرے سے خارج تھا۔ سو یہاں بجلی نام کی کوئی چیز نہ تھی۔ تاریکی سے لڑنے کے لیے لوگوں نے ہر گھر میں لالٹین لٹکا رکھی تھی اور جنہیں اس کی بھی سکت نہ تھی وہ اپنے چبوتروں کو خودساختہ چراغوں سے روشن کیے ہوئے تھے۔

حامد گھر کی طرف آ رہا تھا۔ اس کے ذہن کے افق پر بے شمار سوالات ابھر رہے تھے کہ بنا کسی جرم کے پولیس نے اسے گرفتار کیوں کیا؟ رانی کے دماغ پر اس کا کیا اثر مرتب

ہوگا؟ بیوی نہ جانے کتنی پریشان ہوگی؟ اس حادثہ کے بعد تو اس کا بھائی راشد بڑا فخر محسوس کر رہا ہوگا؟ اب اگلا قدم کیا ہونا چاہیے............؟

ان ساری پہیلیوں کو بجھاتے ہوئے آدھے راستے میں وہ ایک نالے میں گر پڑا۔ ''اونہہ! یہ سب میرے ہی ساتھ ہونا ہے'' وہ باہر نکل کر پائجامے کا کیچڑ صاف کرتے ہوئے بڑبڑایا۔

اس کی نظر قریب ہی ایک ہنڈ پمپ پہ پڑی۔ وہاں ڈھل دھلا کے وہ پھر سڑک پر چل پڑا جہاں اس کا گزر ایک قبرستان سے ہوا۔ وہ اکثر قبرستان کو دیکھ کر ڈر جایا کرتا تھا۔ اس لیے نہیں کہ وہ موت سے خائف تھا بلکہ قبرستان سے وابستہ ان فوق الفطرت کہانیوں سے جو اس نے سن رکھی تھیں۔ اس قبرستان میں ''مزارِ بابا باقر شہید'' نامی ایک بہت ہی مشہور آستانہ تھا۔ حامد نے ٹھہر کر اپنی آنکھیں بند کیں۔ روضے کی جانب رخ کر کے کچھ دعائیں پڑھیں اور پھر گھر کی طرف چلتا بنا۔

پورا گاؤں نیند کے آغوش میں تھا۔ ایک اس کی بیوی تھی جو اس کی آس لگائے بیٹھی تھی۔ گاؤں میں بجلی نہ ہونے کا سب سے بڑا فائدہ یہ تھا کہ لوگ شام ڈھلتے ہی اپنے بستروں سے لپٹ جاتے تھے۔ آخر کار وہ رات کے تقریباً دس بجے پہنچ گیا۔ بیوی نے کھانا لگا دیا۔ حامد نے پانی چھڑک کر اپنا چہرہ دھویا۔ اس کے دروازے پر ٹمٹماتے ہوئے چراغ میں تیل کا آخری قطرہ تک جل چکا تھا جبکہ راشد کے دروازے میں لالٹین روشن تھی۔ جب جب گلی سے کوئی بائک سوار یا سائیکل سوار گزرتا کتے ان پر بھونکنے لگتے۔

''ان سب کے بارے میں کیا سوچا؟'' حامد کی رفیقۂ حیات نے بڑے اضطراب سے پوچھا۔

''کس کے بارے میں؟'' حامد نے کہا۔

''کھانے کے بارے میں'' اس کی بیوی جھنجھلا کر شرارت سے بولی۔ اس نے بیوی کو سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ اس کے لبوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ پھر دونوں ہنس پڑے۔

''مقدمہ کے متعلق''

''نہیں''

''پھر؟''

''پیسے کا سوچا؟''

''کون سا پیسہ؟''

''وہ جو میں نے تمہاری رہائی کے لیے خرچ کیے''

''کتنا؟''

''پانچ ہزار''۔

''پانچ ہزار؟'' اتنے روپے تمہارے پاس کہاں سے آئے؟''

''چاند میاں!''

''مجھے یقین نہیں ہو رہا ہے کہ میری خاطر اتنے روپے تم نے اس کتے کے پلے کو دے دیے!''

''جی! دراصل اس کو میں نے اپنے گہنے دے دیے''

''کیا؟ تم نے اپنے گہنے بیچ دیے؟''

''نہیں۔ میں نے پانچ فیصد سود پر اس کے پاس اپنا زیور گروی رکھا ہے''

''اچھا......گروی''

''کیوں کیا ایسا تم نے؟ مجھے معلوم ہے وہ کتنے اہم تھے۔''

''میری نظر میں تم سے زیادہ اہم کچھ نہیں'' قریب جا کر اس کا بوسہ لیتے ہوئے بولی

''چلواب فوراً سو جاؤ کیونکہ کل صبح تمہیں جلدی اٹھنا ہے رانی کی استانی سے بات کرنی ہے، وہ ٹیوشن کی فیس کا مطالبہ کرسکتی ہے'' حامد کی بیوی اس کو یاد دہانی کراتے ہوئے بولی۔

''کتنے فیس ہو گئے ہوں گے؟ حامد نے پوچھا۔

''وہی کچھ دس روپیے''

''خیر،کل اس کی فیس دیدو اور آئندہ آنے کو منع کر دینا''۔

''مگر کیوں؟''

''اب ہمیں سونا چاہیے ،اتنی رات ان چیزوں پر بحث نہیں کرتے''۔ حامد نے کہا اور مزید گفتگو سے بچنے کے لیے خود کو کمبل سے ڈھنک لیا۔

اس کی بیوی نے اپنے خاوند کا حربہ بھانپ لیا اور اس مسئلہ کو کسی اور وقت کے لیے ٹال دیا۔

رانی اب تک لکھنے، پڑھنے کے فن سے مکمل آشنا نہ ہوئی تھی۔ ہاں! وہ قرآن ضرور پڑھ لیتی تھی۔ رہی بات اردو کی تو وہ بہ مشکل ہی اردو لکھ پڑھ سکتی تھی۔

حامد کے والد نہایت پڑھے لکھے اور عزت دار آدمی تھے۔ اڑوس پڑوس کے گاؤں تک میں کوئی ان کے پایہ کا نہ تھا۔ حامد جب بلوغت کے منازل طے کر رہا تھا تبھی اس کے ابا رحلت کر گئے اور وہ کچھ خاص تعلیم حاصل نہ کر سکا۔ پھر اس کے بڑے بھائی راشد نے اپنے دونوں بھائی حامد اور زاہد کی کفالت کی ذمہ داری سنبھالی۔ اور اب وہ ان کی طفولیت کی دیکھ بھال میں صرف ہوئے اخراجات اپنے دونوں بھائیوں سے واپس لینا چاہتا تھا۔

راشد کو اپنے پانچ بیٹوں پر بڑا غرور تھا۔

حامد کے بھی چار اولاد تھیں۔ سب سے بڑی رانی تھی پھر عابد پھر جاوید اور سب سے

چھوٹی لیلیٰ۔

وقت کا قافلہ گزرتا چلا گیا مگر وہ لمحے جو حامد نے جیل میں گزارے تھے اس کے ذہن پر نقشِ حجر بن کے رہ گئے۔

حامد کے پاس خاصی زمین تھی جس سے غلّے اُگا کر وہ اپنے بال بچے کی پرورش کر سکتا تھا۔ جب تینوں بھائیوں میں جائداد کا بٹوارہ ہوا تو حامد کے بڑے بھائی راشد نے اپنے حق سے زیادہ زمین پر قبضہ جمانے کی کوشش کی۔ نتیجتاً دوسرے بھائیوں نے اس کی لالچ کی مخالفت شروع کر دی۔ یہیں سے ان کے درمیان قانونی جنگ کی بنیاد پڑی۔ بہت جلد اس معاملے کو عزت و دستار کا رنگ دے دیا گیا اور دن بہ دن تینوں ایک دوسرے کو نیچا دکھانے کے درپے ہو گئے۔ رفتہ رفتہ ان کی توجّہ معاشی زندگی اور بچوں کی تعلیم و تربیت سے ہٹ کر اسی قانونی جنگ پر مرکوز ہو گئی۔ اس طرح کی جنگ عموماً ان متوسط طبقہ کے خاندانوں میں نسلاً بعد نسلٍ چلی آ رہی تھی۔

ایک ماں کی نظر میں اس کے بچّوں کی خوشحال زندگی سے زیادہ اہمیت کی حامل کوئی شی نہیں ہو سکتی۔ اس لیے حامد کی بیوی کو ہمیشہ اپنے بچوں کی فکر لاحق رہتی۔

اگلے دن حامد کے بیدار ہوتے ہی اس کی بیوی نے رات کی نامکمل داستان چھیڑ دی۔ ''بچوں کی تعلیم سے آپ کو کیا تکلیف ہے؟ کیا کوٹ کچہری کی جنگ آپ کے نزدیک بچوں کی تعلیم سے زیادہ اہم ہے؟'' اس نے تھوڑے غصے سے تاکیدی انداز میں پوچھا۔

''اس کو پڑھا کر تمہیں کیا مل جائے گا؟ وہ ایک لڑکی ہے۔ کیا تمہاری ضعیفی میں وہ تمہیں پیسے کما کر دے گی؟ سب پر طرۃ یہ کہ وہ اپاہج ہے۔ ہمیں تو یہ فکر ہونی چاہیے کہ اس کے ہاتھ پیلے کیسے ہونگے؟ عنقریب وہ چودہ کی ہو جائے گی۔ کیا تم نے یہ خیال کر رکھا ہے

کہ آسانی سے اس کے لیے کوئی رشتہ مل جائے گا۔ ارے نہیں۔ اس کے لیے خاک چھاننے پڑجائیں گے۔ کون کرے گا شادی اس لنگڑی بچی سے؟ ہم اپنے عابد اور جاوید کو خوب پڑھائیں گے تاکہ مستقبل میں ہمارا سہارا بن سکے۔ یہی میرا فیصلہ ہے اور میں اس سلسلے میں تمہارے ساتھ اور کوئی بحث نہیں کرسکتا سمجھی!''۔

حامد نے تقریباً ڈانٹتے ہوئے کہا۔

اس کی بیوی سوائے رونے کے اور کچھ نہ کرسکی۔

ایک مثالی شریک حیات کا یہی طرۂ امتیاز تھا کہ وہ آنکھیں بند کرکے اپنے شوہر کی ہربات پر سرِ تسلیم خم کردے۔ اس نے اپنی اسی بیٹی کے لیے کئی خواب سجا رکھے تھے مایوسی جس کا مقدر بن چکی تھی پر وہ بیچاری کیا کرسکتی تھی؟

رانی کے والدین کی بلند آواز بحث ومباحثہ نے رانی کو جگا دیا اور رانی نے ساری باتیں سُن لیں۔ وہ اتنی بھی نادان نہیں تھی کہ والدین کی بحث اس کے پلّے نہ پڑتی۔ غصّہ تو اسے بھی آرہا تھا مگر وہ اپنے جذبات کا اظہار اپنے والدین سے نہ کرسکی۔

وہ یہ ساری باتیں فوراً اپنی سہیلیوں کو بتانا چاہتی تھی مگر اتنی صبح اس کی ملاقات کسی ایک سہیلی سے بھی نہ ہوسکی کیونکہ وہ سب مصروفِ تعلیم تھیں۔ ''کیا مجھے اس سلسلے میں امّی سے بات کرنی چاہیے؟ نہیں نہیں! وہ تو پہلے ہی الجھن میں ہیں مجھے مزید ان کی پریشانی میں اضافہ نہیں کرنا چاہیے'' رانی نے سوچا۔

''میں کیا کروں؟'' یہی بہتر ہے کہ میں ایسی نقل کروں کہ گویا میں نے کچھ سنا ہی نہیں۔ آخرکار ابا نے کچھ غلط تو نہیں کہا۔ میں ایک معذور لڑکی ہوں اور میں اپنے والدین کا سہارا ابھی نہیں بن سکتی۔

مجھے کوئی حق نہیں بنتا کہ میں مزید انہیں پریشانی میں مبتلا کروں۔ ایک لڑکی کی تعلیم

کا کوئی فائدہ نہیں۔ کیوں کہ عنقریب میرا نکاح ہو جائے گا اور پھر میرے ہاتھ میں کچن کے امور کی باگ ڈور ہوگی۔ میرے والدین کو میرا رشتہ ڈھونڈنے میں دشواریوں کا سامنا کرنا ہوگا''۔

بستر پر لیٹ کر آنکھین بند کر کے وہ سوچتی رہی۔ اس کے رخسار آنسوؤں سے نم ہو چکے تھے۔ تبھی اس نے اپنے سر بالیں اپنی والدہ کی انگلیوں کی حرارت محسوس کی جو اس کے بالوں کو شفقت سے سہلا رہی تھی۔ رانی آنسو پونچھتے ہوئے کھڑی ہوئی اور اپنی ماں سے لپٹ گئی۔ ماں نے اس کے پشت پر دستِ شفقت پھیرا۔

حامد اب بھی اپنے بڑے بھائی راشد سے نپٹنے کی سوچ میں مصروف تھا۔ بچوں کے لیے اس کے پاس وقت ہی کہاں تھا۔ گرچہ اس نے اپنے بیٹوں کی تعلیم کے متعلق پریشانی کا اظہار کیا تھا مگر اس کو اس بات کی کوئی فکر نہ تھی۔ اس نے اپنے وکیل سے ایک میٹنگ طے کی تھی اور اس کے ساتھ زمین کے بٹوارہ سوٹ پر تبادلۂ خیال کرنا چاہتا تھا۔

حامد کو اپنے بھائی راشد کے فرضی مقدمہ دائر کرنے کی وجہ سے جیل کی ہوا کھانی پڑی تھی۔ اب حامد کسی نہ کسی طرح بھائی سے انتقام کے منصوبے بنا رہا تھا۔ اب یہی اس کا سپنا تھا۔ اس کو جیل جانے کی ذلّت خوب یاد تھی۔ ان کا گاؤں کچھ خاص بڑا نہ تھا۔ وہی کوئی دو سو گھروں کی آبادی ہوگی۔ گاؤں کے قلب میں ''حاجی ہاؤس'' نام کی ایک بڑی سی حویلی تھی جو حامد، زاہد اور راشد کے ابا حاجی نعیم نے تعمیر کروائی تھی۔ حامد کا گھر وسط میں تھا۔ راشد کا گھر باقی دونوں بھائیوں سے کچھ بڑا تھا کیونکہ اس نے بے ایمانی سے زیادہ زمین ہڑپ لی تھی۔ باقی نصف حصے میں پورا گاؤں آباد تھا۔ جب حاجی نعیم باحیات تھے تب کسی کے اندر یہ جرأت نہ ہوتی کہ بغیر سلام کیے ان کے آگے سے گزر سکے، اور یہ ان کے خوف کی وجہ سے نہیں تھا بلکہ لوگوں کے دلوں میں احترام کا جذبہ تھا۔ حاجی نعیم گاؤں والوں کے

مسیحا تھے۔

حاجی صاحب نے دو کنویں کھودوائے تھے جن سے پورا گاؤں سیراب ہوتا تھا یہاں تک کہ اکیسویں صدی میں بھی یہی دو کنویں گاؤں والوں کی پیاس بجھانے کے کام آتے تھے۔ مگر اب حاجی صاحب کا احترام ایک قصۂ پارینہ بن چکا تھا۔ یہ تینوں بھائی بھی گاؤں والوں کے محترم تھے مگر جب سے یہ لوگ باہم دست و گریباں ہوئے، لوگوں کے دلوں سے ان کے عظمت کے نقوش مٹتے چلے گئے۔

سڑک کے دونوں کنارے رہائشی مکانات ایک دوسرے سے جکڑے ہوئے تھے۔ اور گاؤں کے پیچھے تا حد نگاہ کھیتیاں ہی کھیتیاں تھیں۔ وہاں اگر کوئی چیز نظر آنے والی تھی تو وہ جانبِ مغرب کے آخری کنارے پر نہر کی باندھ تھی۔

حامد کو پہلے اپنے بھائی سے انتقام لینا تھا اور اس کے کاندھے پر دوسرا بوجھ رانی کا بیاہ تھا۔ کم از کم حامد کے لیے تو یہ دونوں کام اتنا ہی دشوار تھا جتنا امریکہ کے لیے اسامہ بن لادن کی گرفتاری۔

رانی کو ہر حال میں خوش رہنے کی عادت تھی۔ مگر اس کو ہر لمحہ یہ سوال ستاتے تھے کہ جب وہ نہ ہوگی گھر کے کام کاج کون کرے گا؟ اس کے نکاح کے بعد ماں کتنی اکیلی ہو جائے گی۔ سارے کام امی کو خود کرنے پڑیں گے۔

ادھر حامد کے انتقام کا پاگل پن، اور بچوں کی تعلیم کی فکر لمحہ لمحہ رانی کی امی کو کھائے جا رہی تھی۔ ایک دن موقع لگا کر اس نے حامد کو عابد کی تعلیم کے بارے میں طعنہ بھی دیا مگر وہ اس کی سنتا ہی کب تھا۔

وہ ہر بار یہی کہہ کے ٹال دیتا کہ میں ابھی اس کی تعلیم کا بوجھ نہیں اٹھا سکتا مگر اس مرتبہ اس کی بیوی بازی لے گئی اور اپنے خاوند کو عابد کے مدرسہ بھیجنے پر راضی کر گئی۔

دوسراب باب

حامد کے خسر حامد کے گھر آئے ۔وہ گورمنٹ اسکول کے معلم تھے اور سرکاری افسران کے ساتھ ان کے بڑے تانے بانے تھے۔اس نے حامد کے سامنے پیشکش رکھی کہ اگر وہ اپنے گاؤں میں پرائمری اسکول لے لیے زمین وقف کرے گا تو اس کے بڑے سودمند نتائج بر آمد ہوں گے۔

’’زمین کا ایک ٹکڑا تمہارے گاؤں کو پرائمری اسکول کی دولت سے ہمکنار کردے گا۔تمہارے بچے یہیں تمہاری نگاہوں کے سامنے پڑھیں گے اور گاؤں بھر کے بچے، بچیاں کسی اور جگہ کا سفر کیے بغیر ہی تعلیم یافتہ ہونے کے لائق ہوجائیں گی‘‘۔

اس کے خسر نے اس کو لبھانے کی کوشش کی ۔اس کی تجویز حامد کے کے پلّے نہ پڑی۔ کیونکہ وہ ساری چیزیں حامد کے سمجھ میں نہیں آتیں جو براہِ راست اس کے لیے نفع بخش نہ ہوں۔

’’مجھے کیا ملے گا؟‘‘ کیا اس میں میرا یا میری فیملی کا کوئی فائدہ ہے؟‘‘

حامد نے بلا کسی تمہید کے پوچھ لیا۔

’’ہاں !ہاں! اس میں تمہیں اور تمہاری اہلیہ کو فائدہ ہوگا۔ میری دخترِ نیک اختر کو سرکاری ملازمت مل جائے گی؟‘‘

اس کے خسر نے اپنی آخری اور کارگر چال چلی۔

''ٹھیک ہے۔مگر وہ تو انگوٹھا چھاپ ہے۔وہ معلّمہ کیسے بن سکتی ہے؟''

اب حامد کا تجسس تھوڑا بڑھ رہا تھا۔

''میں نے پیشگی سارا انتظام کرلیا ہے۔میرے ایک دوست ہیں جو سرکاری اسکول میں معلم ہیں۔وہ میری بیٹی کو آٹھویں درجے کی سند مہیا کرائیں گے''۔

اس کے سُسَر بھی ایک مدرسے کے استاد تھے اور معاشرے میں ان کی خاصی عزت تھی۔

''ایک اور سوال''

حامد اپنے آخری شبہے کا ازالہ چاہتا تھا۔

''وہ پڑھنے ،لکھنے سے نابلد ہے۔اس کو تو اپنا دستخط تک کرنا نہیں آتا وہ استانی بن کے بچوں کو کیوں کر پڑھائے گی؟''

''اس میں پریشان ہونے کی کوئی بات نہیں میرے عزیز! کتنے سرکاری ملازم پڑھانے کے فن سے آگاہ ہیں؟ میری ملاقات تو اب تک ایک سے بھی نہیں ہوئی۔جہاں تک معاملہ دستخط کا ہے وہ تو میں آدھے گھنٹے میں اسے سکھادوں گا۔پھر سب کچھ ٹھیک ہوجائے گا''۔اس کے سُسَر نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔

''مگر.........مگر.....؟'' حامد کچھ نہ کہہ سکا اور اپنے سُسر کی ترکیب سے متفق ہوگیا۔

کھانا سے فارغ ہوکر حامد کے سُسر نے دو چھوٹے چھوٹے تھیلے دیے۔

دراصل یہ ایک رسم تھی کہ جب کبھی کوئی باپ اپنی منکوحہ بیٹی کے گھر جاتا تو کچھ گھر کی پکی پکائی چیزیں یا اپنے کھیت کی پیداوار چیز اپنے ساتھ لے کر جاتا۔

انہوں نے بیگ میز کے نیچے چھپادی۔

پھر گفتگو کا سلسلہ چلتا رہا۔

''اور حالات کیسے ہیں؟''

حامد کے سُسر نے اپنی بیٹی سے دریافت کیا۔

''کچھ اچھا نہیں گزر رہا ہے''۔رانی کے بیاہ کو لیکر میں بہت فکر مند ہوں۔وہ اپاہج بیٹی ہے۔اس کے لیے مناسب جوڑ تلاش کرنا بہت مشکل ہوگا''۔

''انشاءاللہ عنقریب سب کچھ اچھا ہو جائے گا''

اس نے وہی گھسے پٹے انداز میں دلاسہ دیا۔

''میرے بھتیجے کی تین اولاد ہیں۔ایک تو گزشتہ برس ہی ازدواجی زندگی سے منسلک ہو چکا ہے۔اب رہ گیا دوسرا جو بڑا ذہین اور صوم وصلاۃ کا پابند ہے۔وہ لوگ اپنے خاندان میں رشتہ کرنے کے خواہش مند ہیں مگر مسئلہ یہ ہے کہ نہ تو ان کے پاس کچھ زیادہ پیسے ویسے ہیں اور نہ ہی کوئی زمین جائداد۔بڑے تنگ دست لوگ ہیں''۔

''کوئی بات نہیں ابّا! مجھے اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ وہ لوگ غریب ہیں۔فکر تو یہ ہے کہ کیا وہ لوگ رانی کو اپنی بہو کے طور کبول کریں گے کیونکہ وہ.............؟''۔

''یہ مجھ پہ چھوڑ دو''۔

''اگر تمہیں کوئی اعتراض نہ ہو تو میں بات آگے بڑھاؤں''۔اس کے ابا نے قطع کلامی کرتے ہوئے کہا۔

''ہم نے عابد کو مدرسہ بھیجنے کا فیصلہ کیا ہے تاکہ وہ اچھی تعلیم سے ہمکنار ہو سکے۔کیا آپ کے علم میں کوئی اچھا مدرسہ ہے؟''

''اگلے ہفتہ میں خود آ کر اس کو مدرسہ لے جاؤں گا۔میں ایک اچھا مدرسہ جانتا ہوں

جہاں چھوٹے بچوں کو تعلیم دی جاتی ہے۔ جہاں میں معلم ہوں وہاں صرف بڑے سیانے لڑکے ہی پڑھتے ہیں۔ آئندہ ہفتہ اس کو تیار رکھنا۔ میں آؤں گا اور اس کو اپنے ساتھ لے جاؤں گا''۔ حامد کے سُسر ایک حلاّل المشکلات کی طرح آئے اور تمام پریشانیوں کا حل پیش کر گیے۔

''چلو۔ اب میں چلتا ہوں''۔

حامد کی بیوی رونے لگی۔ کسی پریشانی کی وجہ سے نہیں بلکہ یہ ایک رواج تھا۔

پھر اس نے اپنی نواسی، نواسوں کو ایک ایک روپے کا سکہ دیا اور چلا گیا۔

ادھر وہ گئے اور ادھر پوری فیملی اس کے لائے ہوئے تھیلے پر ٹوٹ پڑی۔ اس میں کھانے پینے کی کچھ چیزیں تھیں۔ شاید اسی حرکت کے خوف سے حامد کی بیوی نے ابا کی روانگی تک اس تھیلے کو چھپا رکھا تھا۔

اگلی شام سے عابد کی مدرسہ روانگی کی تیاری شروع ہوگئی۔ ہر شام دھان کوٹنے کے لیے پڑوس کی عورتیں بلائی جاتیں۔ دو عورتیں یکے بعد دیگرے مُوسَل (اناج کوٹنے کا آلے) سے ضرب لگاتیں جبکہ ایک تیسری خاتون کو اوکھلی میں دھان ڈالتے رہنے پر معین کر دیا جاتا۔ یہ عورتیں خوب مزے لے لے کر کام کرتیں۔ ان مواقع کے لیے انہوں نے چند گیت بھی بنا رکھے تھے جنہیں انہیں مواقع پر گایا کرتی تھیں۔ یہ سلسلہ ایک ہفتہ تک دراز رہا۔ ایک ہفتہ میں انہوں نے ایک تھیلا بھر دھان کوٹ لیا جس کا وزن تقریباً پچیس کلو ہوگا۔

بچے ایک بار مدرسہ چلے گئے تو مسلسل چار پانچ مہینے تک ان کو وہیں ٹھہرنا ہوتا ہے اور کچھ بچے تو سال دو سال تک گھر نہیں آتے۔

دوپہر اور رات کا کھانا تو مدرسہ کی جانب سے مفت میں مل جاتا ہے مگر ناشتے

کا انتظام خود طلبہ کے ذمے ہوتا ہے۔ یہ ساری تیاریاں فقط ناشتے کے لیے تھیں۔

صابن ،شیمپو، منجن وغیرہ کے اخراجات والدین اور سرپرستوں کو خود سہنے پڑتے ہیں تاکہ بچے کسی کے محتاج نہ رہیں۔

ناشتہ کے لیے چوڑا اور 'کیسر' تیار کرلیا گیا۔ 'کیسر' شکر اور چاول کے آٹے کی آمیزش سے بنا ٹینس کی گیند کے حجم برابر ہوتا ہے۔

اگلے دن صبح صبح عابد کے نانا اس کو مدرسہ لے جانے کے لیے آگیے اور ساتھ ہی ساتھ حامد کی فیملی کو ایک خوش خبری بھی سنائی۔ وہ یہ کہ ان کے چچازاد بھائی نے ہاں کہہ دیا ہے اور سگائی کی نیت سے لڑکی دیکھنے آنے والے ہیں۔

''میں نے ان کی آمد کے لیے منگل کا دن متعین کیا ہے، توقع ہے کہ سب کچھ ٹھیک ہی ہوگا، اگر متعین دن تمہارے لیے مناسب نہ ہو تو کوئی بات نہیں۔ تاریخ میں تبدیلی کی گنجائش ہے''۔ عابد کے نانا نے اطلاع دیتے ہوئے کہا۔

''نہیں !نہیں ! ، آپ نے جو دن چنا ہے بالکل ٹھیک ہے۔ میں بے حد خوش ہوں۔ سب کام جلدی جلدی ہوتا جارہا ہے۔ اللہ کرے سب کام ٹھیک ہو''۔

حامد وفورِ جذبات سے بھر گیا اور بار بار اپنے سُسَر کا شکریہ ادا کرنے لگا۔

عابد کی روانگی کا وقت آ گیا۔ عابد پہلی بار گھر سے کہیں دور جا رہا تھا اس لیے وہ معاملے کی نزاکت کو سمجھنے سے قاصر تھا۔ وہ اپنے نانا جان کے ساتھ بلا کسی چوں وچرا کے چلا گیا۔

سائیکل کے پیچھے کھانے سے بھرا ایک بڑا سا بیگ مضبوطی سے باندھ دیا گیا۔ اور ہینڈل میں ایک چھوٹا سا تھیلا لٹکایا گیا جس میں صابن ،شیمپو، منجن وغیرہ روزمرہ کے استعمال کی چیزیں تھیں۔ شدید گرمی تھی اور دھوپ جھلسا دینے والی تھی اس لیے جب وہ

منزل مقصود کی طرف نکلے تو عابد کے سر کو رومال سے ڈھنک دیا گیا۔

وہ مدرسہ کے وسیع وعریض احاطے میں داخل ہو گئے۔ جہاں وسط میں ایک ہینڈ پمپ تھا جس کے آس پاس دو تین بالٹیاں پڑی تھیں۔ اور دس بارہ سال کے چند طلبہ کھیل کے دھن میں مست تھے۔ جیسے ہی ان کی نگاہ عابد اور اس کے نانا پر پڑی وہ بھانپ گئے کہ ان کی طرح عابد بھی داخلہ کے پھندے میں پھنسنے جا رہا ہے۔

ادھر حامد کے گھر پہ سگائی کی تیاریاں شباب پر تھیں۔ حامد کے گھر کی عقبی دیوار ڈھے گئی تھی اور تقریب کو صرف ایک ہی ہفتہ رہ گیا تھا اس لیے دیوار کی تعمیر نو کے لیے علی الفور معمار کو بلایا گیا۔

حامد کو ڈھیر ساری تیاریاں کرنی تھیں اس لیے اس نے گوالا (دودھ فروش) کو بلا کر دودھ کا آرڈر دے دیا۔ گھر کے رنگ وروغن کے لیے مزدور بھی آ گئے۔ اس مخصوص دن میں بجلی کے انتظام وانصرام کے لیے حامد نے کرایے کے جنریٹر والے سے بھی قول وقرار کر لیا۔ حامد کو اپنے تمام خویش واقارب کو دعوت دینی تھی۔ چونکہ یہ اس کی فیملی میں سگائی کی پہلی تقریب تھی اس لیے سماجی طور پر اس کے تمام بھائیوں کو مدعو کیا جانا نہایت ناگزیر تھا۔ شام کے وقت حامد کے گھر پر کثیر تعداد میں گاؤں کے لوگ جمع ہوئے اور تیاری کی بابت ٹوہ لگائی۔ انہوں نے مہمانوں کے استقبال کی تیاری پر تبادلۂ خیال کیا اور اس پر بھی کہ اس مبارک ومسعود موقع پر کس کس کو دعوت دی جا رہی ہے۔ یہ گاؤں کی بہت پرانی روایت تھی کہ جب کبھی کوئی تقریب ہونے والی ہوتی تو گاؤں کے لوگ باہم مجتمع ہو کر تیاری کی نسبت گفتگو کرتے۔ گاؤں والوں نے یہ بھی جاننے کی کوشش کی کہ وہ اپنے بڑے بھائی کو مدعو کر رہا ہے یا نہیں؟ ایک منٹ تک اس نے چپی سادھ لی اور سوچ کی گہرائیوں میں اتر گیا۔ پھر اس نے گاؤں والوں سے ہی مشورہ طلب کیا۔ کیونکہ وہ لوگ بھی اس کے بڑے

بھائی راشد کے کرتوت سے خوب آگاہ تھے۔گاؤں والوں نے آپس میں گفتگو کی اور پھر حامد کو یاددہانی کرائی کہ خوشی کے ان لمحوں میں اسے ماضی کی عداوت کو بھلادینا چاہیے۔کیونکہ وہ چھوٹا بھائی ہے۔تمہیں اس کے پاس جاکر معافی طلب کرنی چاہیے۔حامد کے چہرے کا رنگ فق ہوگیا۔وہ چونکہ سماج کی طاقت سے واقف تھااس لیے بادلِ ناخواستہ ہی سہی اس کو ہاں کرنا پڑا۔اگروہ معاشرہ کا مشورہ ٹھکرادیتا تولوگ اسے تنہا چھوڑ دیتے اور پھر وہ سماج سے الگ ہوکر نہ تواب کچھ سکتا ہے اور نہ مستقبل میں کچھ کرسکے گا۔اوراس پرمستزادیہ کہ کسی خاص موقع پر وہ مدعو ہونے سے بھی رہ جائے گا۔

☆☆☆

تیسرا باب

وہ رات اس کے لیے بہت دشوار گزار تھی۔ وہ بسترِ استراحت پر گیا مگر اپنی رفیقۂ حیات سے ہم کلام نہیں ہوا۔ وہ بھانپ گئی کہ وہ کسی پریشان کُن فکر میں مبتلا ہے لہذا اس نے اپنے شوہرِ نامدار سے کچھ پوچھنا مناسب نہ سمجھا۔ وہ مسلسل فکر کی تہہ میں اترتا چلا گیا۔

''اسی نے مجھے جیل بھیجوایا، ہم تینوں بھائی بچپن میں ایک ساتھ کھیلتے تھے۔ بچپن ہی سے وہ مجھے پست کرنے کے درپے ہے۔ میں نے کبھی ان کا برا نہیں چاہا اور نہ ہی کبھی جواب میں کوئی غلط کلمہ استعمال کیا مگر وہ اب بھی باز نہیں آئے۔ جب میں جیل گیا تو شرمندہ ہونے کے بجائے انہوں نے خود کو لاڈ صاحب سمجھا... کتنی گھٹیا بات ہے.؟ میں تو نہیں جانے والا ان کو شادی کی دعوت دینے۔ یہ الگ بات ہے کہ میں ایک بچی کا باپ ہوں مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ میری اپنی کوئی عزت ہی نہیں۔ کس منہ سے میں ان کے پاس جا کے ماچھی کی فریاد کروں۔ وہ تو مجھ پر قہقہے لگائیں گے اور کہیں گے کہ میں تمہاری ماچھی کے بارے میں سوچوں گا۔ نہیں! میری گیرت کو یہ گوارا نہیں۔ مگر دوسری طرف سماج کے غصے کی تاب بھی نہ لاسکوں گا۔ آخر کار میں کیا کروں؟ میں ان سب کے کرنے پر صرف اس لیے مجبور ہوں کہ میں ایک لڑکی کا باپ ہوں''۔

وہ اپنے خیالات میں اس طرح بہہ گیا کہ وہ یہ تک بھول گیا کہ اس کی شریکِ غم

پہلو میں لیٹی ہوئی ہے اور وہ اس کے آنسوؤں کے قطرات اپنے ہاتھوں پر محسوس کر سکتی ہے۔

''کیا آپ راشد میاں کی دعوت کو لے کر پریشان ہیں''؟

اس نے اپنے سرتاج کا غم بانٹنے کی کوشش کی۔

'' ہاں''

''آپ غم نہ کریں! اس کو اس کے کیے کی سزا اللہ کے یہاں ملے گی''۔ وہ نرمی سے اس کے آنسو پونچھتے ہوئے بولی۔

''اللہ کا کرم ہمیشہ اسی پر کیوں برس رہا ہے؟ کیا وہ کوئی پیر فقیر ہے''؟

وہ فرطِ غضب سے چلا کر بولا۔

''اس نے مجھے جیل بھجوایا۔ میرا کیا کسور تھا؟ اس زمین کے ٹکڑے کے لیے اس نے مجھے پھنسایا! اور اب سماج چاہتا ہے کہ میں راشد میاں سے اس کے رحم کی بھیک مانگوں یہی خدا کا انصاف ہے؟''

وہ ناامیدی کے کلمات بڑبڑاتے ہوئے نیند کے آغوش میں چلا گیا۔

مدرسہ میں مولانا صاحب نے عابد کو دو کام دیے۔ پہلا کام یہ تھا کہ ایک کتاب کے دو صفحات زبانی یاد کرنے تھے اور دوسرا تھا مولانا کا جانگھیا دھو کر صاف کرنا۔

دونوں کام غروبِ شمس سے پہلے پہلے کرنے کی تاکید کی گئی تھی۔

''مولانا صاحب نے اتنا مشکل کام مجھے کیوں دیا؟ جب سے میں ہوش سنبھالا میں نے دیکھا ہے کہ ابا کا کچھا امی دھوتی ہیں۔ مولانا صاحب کی بیوی کہاں ہے؟ لگتا ہے وہ مر چکی ہے''۔ اس ننھے لڑکے نے بڑی معصومیت سے غور کیا۔ ''یہ بھی ممکن ہے کہ ان کی اب تک شادی نہ ہوئی ہو''۔

یہ سب کر کرا کے وہ صرف ایک صفحہ اور دوسرے صفحہ سے چند سطر ہی یاد کر سکا۔ وہ

قدرے گھبرایا ہوا تھا۔شام میں مغرب کی اذان کے وقت مولانا نے عابد کو پکارا اور ایک لوٹا پانی لانے کو کہا۔وہ مولانا کو دیکھ کر بہت مسرور تھا کیوں کہ ابا کے جانے کے بعد سے مولانا ہی تنہا وہ شخص تھے جن سے عابد متعارف تھا۔ابا نے عابد کو مولانا کے ہر حکم کی تعمیل کرنے کو کہا تھا۔نماز سے فراغت کے بعد مولانا نے عابد کو سوکھے کپڑے لانے اور اس کی حفظ کردہ آیتیں سنانے کا حکم دیا۔وہ بہت گھبرایا ہوا تھا اس لیے وہ ایک لفظ بھی نہیں سنا سکا۔''گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔آج تمہارا پہلا دن ہے۔اس لیے تمہیں کوئی سزا نہیں ملے گی۔جا کے سو جاؤ۔مگر اس سے قبل میرا بستر لگا دو پھر جا کے آرام کرنا''۔ عابد بہت خوش ہوا کیونکہ سبق یاد نہ کرنے کے باوجود بھی مولانا کے زدوکوب سے محفوظ رہا مگر جیوں ہی اس کو اپنی بہن کی یاد آئی ،بہن کی سگائی میں موجود نہ رہنے کا بڑا رنج ہوا۔یہ اس کی آپا کی زندگی کا سب سے خوش نما دن تھا۔اور اس پُر بہار موقع پر وہ موجود نہیں تھا۔مگر یہ بھی درست کہ کم سے کم وہ ابا کے روزانہ کے غصے سے تو دور تھا۔اس کے گمان میں مولانا صاحب ایک نیک دل انسان تھے۔وہ مولانا صاحب سے بہت مانوس تھا مگر اب بھی اس کے حاشیۂ ذہن میں ایک سوال گردش کر رہا تھا کہ آخر مولانا نے اس سے اپنے کپڑے کیوں دھلوائے؟'' شاید اس لیے کہ میں ان کا عزیز ہوں''۔

تبھی کوئی دوڑتا ہوا آیا اور مولانا کو اطلاع دی کہ ان کی زوجہ محترمہ کا خط آیا ہے۔ مولانا صاحب خط پڑھنے کے لیے اتاولے ہو رہے تھے۔

''اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ مولانا صاحب شادی شدہ ہیں تو پھر وہ تنہا کیوں رہتے ہیں؟'' ہوسکتا ہے یہاں فیملی کے ساتھ رہنے کا کوئی انتظام وانصرام نہیں ہے یا کیا خبر؟ ہوسکتا ہے اسلام میں اس کی اجازت نہ ہو۔'' اس چھوٹے بچے کے ذہن میں بیشمار جواز ابھرنے لگے۔

"مگر اسلام میں اس کی اجازت ضرور ہوگی ورنہ گاؤں میں مسجد کے امام صاحب اپنی بیوی، بال بچوں کے ساتھ کیوں رہتے؟ گاؤں کا ہر شخص ان کا ادب کرتا ہے یہاں تک کہ چاند میاں جیسا بگڑی شخصیت کا حامل بھی ان کی عزت کرتا ہے"۔

اگلی صبح سورج طلوع ہونے سے بہت پہلے ہی مولانا صاحب آئے اور نہایت نرمی سے عابد کے بالوں پر ہاتھ پھیر کر اس کو بیدار کیا۔ وہ بیدار ہوا اور مدرسہ کے متعین اصول وضوابط کے مطابق دن کی شروعات ہوگئی۔ مولانا صاحب نے ایک بکری پال رکھی تھی جو ہر دم ان کی تاک میں رہتی ۔ تمام طلبہ اس بکری کو بہت لاڈو پیار کرتے اور اس کو بچا ہوا کھانا کھلاتے۔ عابد کو بھی اس بکری کو کھلانا پلانا پسند تھا۔ عابد کی نظر میں رہنے سہنے کے لیے یہ مدرسہ بہت اچھی جگہ تھی۔ چند ساعت کے بعد عابد کو مدرسہ کے دوسرے بچوں کے ساتھ ملنے جلنے کا وقت ملتا اور وہ سب باہم ناشتہ کرتے۔ دوسرے طلبہ کے مطابق عابد کا چوڑا اور کیسر بہت مزے دار تھا۔ عابد اپنے اچھے طور طریقہ کی وجہ سے مدرسہ کے ہر طالب علم کا محبوب تھا۔ اس سے بھی بڑی وجہ یہ تھی کہ وہ اپنا لذیذ کھانا ان کے ساتھ مل بانٹ کر کھاتا تھا۔

☆☆☆

چوتھا باب

رانی قدرے گھبرائی ہوئی، قدرے اداس اور قدرے اتاولی تھی۔ اس کے ذہن میں بہتیرے سوالات ابھر رہے تھے کہ اس کا منگیتر کیسا ہوگا؟ وہ کیا کرتا ہے؟ کیا وہ اس کو محبوب رکھے گا؟ کیا اس کی فیملی اس کو اپنائے گی؟ اس زمانے میں تصویروں کی ادلا بدلی کا رجحان نہیں تھا۔ اس کی دو وجہیں تھیں۔ ایک تو یہ کہ اس وقت تصویر کھنچوانا اتنا آسان نہیں تھا جتنا کہ اب ہے۔ اور دوسری وجہ یہ تھی کہ اس وقت ان کاموں کی مہنگائی اوج پر تھی۔ اس وقت منگیتر بس خواب وخیال کا شہزادہ ہوا کرتا تھا۔ رانی کی سہیلیاں اس کو چھیڑنے لگیں۔ وہ بیچاری کیا کرتی۔ بس جب کوئی اس کے منگیتر کی بات کرتا وہ اپنے چہرے کو اپنی ہتھیلیوں میں ڈوبا لیتی۔ اس نے نہ ہی کبھی اس کو ایک جھلک دیکھا اور نہ تو وہ اس کے بارے میں کچھ جانتی تھی۔ مگر اس نے اپنی پوری زندگی اس کے ساتھ گزر کرنے کا منصوبہ بنالیا تھا کیونکہ اس میں بے شمار خوشیاں پوشیدہ تھیں۔ اس کے والدین، خویش واقارب اور سہیلیاں سب کی یہی چاہت تھی۔ اس وقت اگر رانی کچھ کرسکتی تھی تو وہ خدا سے فریاد کرسکتی تھی کہ یہ سگائی بحسن وخوبی انجام تک پہنچ جائے۔ اس کے معاشرے میں برے لوگوں کی کمی نہیں تھی جو اس سگائی کو توڑنا چاہتے تھے۔ یا تو اس لیے کہ وہ لوگ رانی کی فیملی کے بدخواہ تھے یا اس کے منگیتر کی

فیملی کے۔

حامد کے سُسر آئے، سائیکل کھڑی کی اور اندر داخل ہوگئے۔ وہ تھوڑے سے حیران لگ رہے تھے۔ جیسے ہی وہ اندر داخل ہوئے رانی کی امی ایک کانچ کا گلاس لے کر ہینڈ پمپ کی طرف دوڑ پڑی۔ گلاس میں پانی بھر کر بڑے احترام سے اپنے والد کی خدمت میں پیش کی۔ اس لیے نہیں کہ وہ اس کے والد تھے بلکہ اس کے پیچھے یہ حکمت تھی وہ اس نئے رشتے کے اگوا (ثالث) تھے۔ وہ اندر آئے اور پیشانی پر ہاتھ دھر کے بیٹھ گئے۔ یہ ظاہر کرنے کے لیے کہ وہ بہت الجھے ہوئے ہیں۔

"کیا بات ہوئی؟ سب خیر سلاً تو ہے؟"

حامد نے اپنے سُسر سے دریافت کیا۔

"دراصل۔ نہیں۔ کوئی یہ رشتہ توڑنے کی کوشش کر رہا ہے" اس نے پریشانی ظاہر کرتے ہوئے جواب دیا۔

"یہ کیا کہہ رہے ہیں آپ؟"

اس نے مضطرب ہو کر پوچھا۔

"کل لڑکے کے والد سے میری گفتگو ہوئی۔ وہ شک ظاہر کر رہے تھے۔ وہ کہہ رہے تھے کہ کسی نے اطلاع دی ہے کہ لڑکی معذور ہے۔ مجھے نہیں معلوم کہ کس نے یہ حرکت کی ہے۔"

اس کے سُسر نے جواب دیا۔

"کیا ہ؟"

"کیا آپ نے ان کو یہ نہیں بتایا تھا کہ لڑکی کس کی ہے"

رانی کے والد نے تعجب سے پوچھا۔

"تم لوگ پاگل ہو گئے ہو۔ میں یہ کیسے بتا سکتا تھا۔ اگر میں بتا دیتا تو وہ اس سگائی کے لیے کبھی راضی نہ ہوتے"۔

"اس میں غلط کیا ہے؟"

"یہی تو تدبیر ہے"

"نہیں۔ یہ تدبیر نہیں، دھوکہ ہے"

حامد نے فیصلہ کن انداز میں جواب دیا۔

"اگر تمہارے یہی اصول رہے تو رانی کنواری رہ جائے گی۔ کون بنائے گا اس کو اپنی شریکِ حیات؟ اس کے لیے مناسب رشتہ تلاش کرنا آسان نہیں تھا۔ میں نے کیا یہ کام۔ تم..........تم تو احمق ہو۔ میں کہے دیتا ہوں کہ رانی کا بیاہ کرانا تمہارے بس کی بات نہیں..."

حامد کے سُسر نے اس کو متنبہ کیا۔

"مگر جب وہ لوگ سچ جان لیں گے تب کیا ہوگا؟"

رانی کی ماں نے اس تردد کا حل تلاش کرنے کی کوشش کی۔

"میں نے اس کے لیے بھی ایک تدبیر سوچ رکھی ہے۔ سگائی کے دوران رانی گھر کے بیچوں بیچ بیٹھی رہے گی۔ مہمان آئیں گے مگر آتے ہی گھر میں تھوڑی داخل ہوں گے۔ وہ لوگ مہمان خانہ میں آرام و قیام کریں گے۔ وہ گھر کے اندر آئیں گے اور انگوٹھی پہنانے کی رسم پوری کر کے چلے جائیں گے۔ لڑکی کو باہر جانے کی کوئی ضرورت نہیں۔ مہمان خود باہر چلے جائیں گے۔ انہیں بھنک بھی نہیں لگے گی کہ لڑکی معذور ہے۔ یہ بہت آسان ترکیب ہے"۔

سُسر نے اپنا منصوبہ ظاہر کیا۔ منصوبہ ظاہر کرتے وقت وہ خود کو سب سے

بڑا عقلمند تصور کر رہا تھا۔

''مگر جب نکاح کے بعد وہ لوگ رانی کی حقیقت سے آگاہ ہوں گے تب ہم کیا کریں گے؟''

رانی کی امی نے آخری سوال کی وضاحت چاہی۔ اس سے پہلے کہ حامد کا سُسر کچھ بولتا، حامد بول پڑا

''کوئی اگر مگر نہیں۔ ایک بار نکاح ہو گیا پھر کوئی کچھ نہیں کر سکے گا۔ آخر وہ لوگ بھی تو ہمارے اپنے ہیں''۔

''مگر قابلِ تشویش بات یہ ہے کہ نہ جانے کون اس رشتہ کو بھنگ کرنے کے پیچھے پڑا ہے۔ اگر اس نے لڑکے کی فیملی کو حقیقت بتا دیا تو یہ سگائی اپنے انجام کو نہیں پہنچ سکے گی اور پھر میں اس مشکل کو حل کرنے سے قاصر رہوں گا۔ مگر امید کرتا ہوں کہ وہ لوگ ان کی باتوں پہ کان نہیں دھریں گے''۔

اس کے سُسر پریشان لگ رہے تھے۔

''انشاء اللہ۔ سب کچھ ٹھیک ہی ہوگا۔ خدا مہربان ہے۔ اب ہمیں وقت ضائع کرنے سے کوئی فائدہ نہیں۔ کل تک ساری تیاریاں مکمل ہو جانی چاہیے تاکہ پرسوں آسانی سے سگائی عمل میں آسکے''۔

حامد کے گھر کے باہر ایک بڑا سا زمین کا ٹکڑا تھا۔ گھر کے چاروں طرف ہر دو قدم پر انہوں نے رسیاں باندھیں اور رسیوں میں ست رنگی کاغذ چسپاں کیا۔ یہ کوئی آسان کام نہیں تھا۔ اس کی تکمیل میں دن بھر پانچ لوگوں کی محنت لگی۔ اب ایسا محسوس ہونے لگا تھا کہ اس گھر میں کسی کی سگائی ہونے جارہی ہے۔ لوگوں نے سجاوٹ کے متعلق سوال کرنا شروع کر دیا۔

''کیا ہونے والا ہے؟'' ''کس کی سگائی ہونے جارہی ہے؟''

حامد فخر سے ہر کسی کو جواب دیتا کہ اس کی دخترِ نیک اختر کی منگنی ہونے والی ہے۔انہوں نے رانی کے منگیتر کے لیے تین جوڑے خریدے۔ یہ جوڑے قدرے مہنگے تھے۔مگران کی قیمت رانی کی خوشی سے زیادہ تھوڑے تھی۔رانی بیڈ پر لیٹی ہوئی تھی۔کسی نے اس کی چاہت نہیں پوچھی۔ کیوں کہ سب کو معلوم تھا کہ وہ ایک اچھی لڑکی ہے اس لیے وہ اپنے والدین کے فیصلے سے خوش ہوگی۔بات ایسی ہی تھی۔وہ خوش تھی۔شاید اس لیے کہ وہ اپنے والدین کو خوش دیکھنا چاہتی تھی۔یا اس لیے کہ اس کے دل میں اور کوئی ارمان نہیں تھا۔ یا اس لیے کہ بشمول اس کے ہر لڑکی کی زندگی کا یہی خواب ہوتا ہے۔اگلے دن مہندی کی رسم تھی۔اس کی سہیلیاں اور کچھ دوسری عورتیں اس کے اردگرد حلقہ بنا کر بیٹھ گئیں اور روایتی گیت گانے لگی..........

گیت:

کل تک جو گھر کی زینت تھی وہ غیر ہو چلی
بیٹی ہماری گھر پیا کے سیر کو چلی
مہندی لگا کے اس قدر ذیشان ہوگئی
اپنے ہی گھر میں آج وہ مہمان ہوگئی

رانی کے رخسار پر آنسو ڈھلک گئے۔اس لیے نہیں کہ وہ رنجیدہ خاطر تھی۔اس لیے کہ عنقریب اس کا اپنا گھر ایک رشتہ دار کے گھر کے مانند ہو جائے گا اور وہ ایک ایسی فیملی کا فرد ہو جائے گی جس کے بارے میں اس کو کچھ نہیں معلوم ۔ رانی کے لیے یہ فیصلہ کرنا دشوار تھا کہ اس کا اپنا دل خوش ہے یا غمگین مگر یہ بات یقینی تھی اس کے نکاح کے بعد اس کے والدین کے سر کا بوجھ ہلکا ہو جائے گا اور پھر ان کی زندگی میں بہار مسکرانے لگے گی۔وہ اپنے اس نئے گھر کے خیالوں میں ڈوب گئی جس کی وہ دلہن بننے جارہی تھی۔وہ اتنی سیانی

تو ہو ہی گئی تھی کہ یہ سمجھ سکتی کہ نئے گھر میں چاہے نہ چاہے اسے کثیر ذمہ داریاں ادا کرنی ہوں گی۔ طوعاً و کرہاً گھر کا فرد ہونے کے ناطے اسے تمام فرائض ادا کرنے ہوں گے۔ اس وقت کچھ خائف تھی۔ اس کا خوف یہ تھا کہ کیا وہ ایک معذور لڑکی کو اپنے گھر کا فرد تسلیم کریں گے؟ اس کے ہونے والے منگیتر کے گھر والے اس کی حقیقت سے واقف ہیں یا نہیں؟ اس کے والدین نے اس کا معذور پن لڑکے کی فیملی سے پوشیدہ رکھا تھا۔ عین دوپہر کے وقت حامد کا سُسر ہانپتے کانپتے آیا۔ اس نے ایک جانکاہ خبر سنائی کہ لڑکے والے سگائی کے لیے نہیں آرہے ہیں۔ لڑکے کے والد شدید بخار میں مبتلا ہیں!''

رانی کے ابا نے کہا

''نہیں نہیں! میں سنجیدگی سے کہہ رہا ہوں۔ یہی حقیقت ہے۔ مگر میرے خیال سے اس کے ابا کو بخار نہیں ہے۔

(ان کے نہ آنے کی) وجہ بالکل مختلف ہے۔ شاید کسی نے انہیں بتادیا کہ رانی معذور ہے''۔

اس نے حامد کو یقین دہانی کراتے ہوئے کہا کہ وہ مذاق نہیں کر رہا تھا۔

اب جا کے رانی کو پتہ چلا کہ اس کے والدین نے لڑکے والوں سے حقیقت چھپا رکھی ہے۔ وہ یہ خبر سن کے دم بخود رہ گئی۔ اس نے خواب وخیال میں بھی نہ سوچا تھا کہ اس کے والدین بھی جھوٹ بول سکتے ہیں۔ سگائی بھنگ ہونے کی وجہ سے جشن کا سماں ماتم میں تبدیل ہوگیا۔ فیملی کا ہر فرد غمگین تھا۔ اگرچہ ان میں سے بعض اپنے رنج وغم کا اظہار کر رہے تھے مگر درحقیقت وہ دل ہی دل میں خوش تھے۔ کیونکہ وہ سچے دوست نہیں تھے۔ رنگ برنگے کاغذ ہوا میں پھڑ پھڑاتے رہ گئے۔ دیواروں پر نقاشیوں کا رنگ اپنی تمام تر جلوہ سامانیوں کے باوجود پھیکا پڑ چکا تھا۔ رانی کی ماں گھر کے اندر تنہا بیٹھی تھی۔ وہ تذبذب کا شکار ہو چکی

تھی، حامد کا غصہ ضبط سے باہر تھا۔ حامد کے سسر یہ پتہ لگانے میں مشغول تھے کہ کون ہے جس نے درمیان میں آگ لگائی اور کیوں؟ غصہ کے عالم میں حامد نے اپنے سسر کا بھی خیال نہیں کیا اور انہیں بھی خوب اچھے برے الفاظ سے نواز دیا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ اپنی بیٹی رانی کی اماں کے پاس گیا اور صاف صاف کہہ دیا کہ وہ اب مستقبل میں کبھی رانی کے بیاہ سے متعلق کسی طرح کی مدد نہیں کرے گا۔ ہاں ہر ہفتہ دو ہفتہ میں اس سے ملنے ضرور آیا کرے گا کیونکہ آخر تو وہ اس کی بیٹی ہے۔ رانی کا خواب اجڑ گیا۔ اس کے والد کے خرمنِ امید میں آگ لگ گئی۔ اس کی امی کی پریشانی دو بالا ہو چکی تھی کیونکہ وہ یہ فیصلہ کرنے سے قاصر تھی کہ کس منہ سے جا کے وہ رانی کو یہ منحوس خبر سنائے گی۔ اور نہ جانے اس پر رانی کا ردعمل کیا ہوگا۔ ان سب پر مستزاد یہ کہ جو کثیر رقم انہوں نے اس متوقع سگائی میں خرچ کی سب رائیگاں چلی گئی۔

پانچواں باب

اب عابد خوش رہنے لگا تھا۔ وہ خوابوں کی دنیا کا سیر کرنے لگا کہ وہ دن دور نہیں جب وہ پڑھ لکھ کر اپنے دادا کی طرح پورے گاؤں کا محترم و مکرم شخص بن جائے گا۔ ''اب ان کی نظر میں میں شرارتی نہیں رہوں گا بلکہ وہ لوگ عزت سے میرا نام پکاریں گے''۔

مغرب کے بعد عابد جب اپنے دوستوں کے ساتھ چھت پر بیٹھ کر قرآن کی آیتیں حفظ کر رہا تھا تبھی اس نے نگاہ اٹھا کر آسمان کی طرف دیکھا۔ ہر طرف ستارے جھلملا رہے تھے۔ ستاروں کی جگمگاہٹ نے اسے یاد دہانی کرائی کہ آج اس کی پیاری ہمشیرہ کی سگائی ہو رہی ہوگی اور وہ بیچارہ یہاں پڑا ہوا ہے۔ مگر ایک اس کے نہ ہونے سے کیا فرق پڑتا ہے۔ باقی سب تو خوشیوں میں شامل ہی ہوں گے۔ گھر پر جشن کا سماں ہوگا۔ ابا امی خوش ہوں گے۔ اور اسی بہانے ابا کے ذہن سے جیل والا حادثہ اتر جائے گا۔ وہ خیالوں میں ڈوبا رہا اور وقت نکل گیا۔ وہ آج رات کا سبق بھی یاد نہ کر سکا۔ پھر وہ اپنا برتن باسن دھو کر کھانا لینے کے لیے قطار میں کھڑا ہو گیا۔ ایک نہایت مسٹنڈا شخص تھوڑی سی اونچائی پر بیٹھ کر تندوری روٹی تیار کرتا اور دو دو روٹیاں ہر طالبِ علم کو دیتا جا رہا تھا۔ وہیں ایک لمبی داڑھی والا آدمی ایک بڑی سی ہانڈی کے آگے بیٹھ کر باری باری ہر طالب علم کو ایک چمچہ بیف اور ایک چمچہ شوربا دیے جاتا تھا۔ جو اس کا محبوبِ نظر ہوتا اس کو آدھا چمچہ الگ سے دیتا۔ اس

کی نظر میں اچھے بننے کا معیار طالبِ علم کا بہترین اخلاق نہیں تھا بلکہ طالبِ علم کا حُسن تھا۔ عابد بھی بڑا وجیہہ تھا اس لیے اس آدمی کی دوہری سخاوت کا صدقہ پا کر خوش ہو گیا۔ وہ کھانا تقریباً کھا چکا تھا تبھی دفعتاً مدرسہ کے احاطہ میں مسجد کے باہر سے آہ وفغاں کی آواز بلند ہوئی۔ طلبہ کو میدان کی طرف بھاگتے ہوئے دیکھ کر وہ بھی ان کے ساتھ دوڑا۔ مجمع میں پہنچ کر اس نے ایک طالب علم کی چیخ وپکار کی آواز سنی۔ ایک مولانا کے ہاتھ میں پتلی اور لمبی چھڑی تھی جو سامنے کھڑے ہو کر اس کو ڈانٹ رہے تھے۔ مولانا کا غصہ سوڈگری سے تجاوز کر چکا تھا۔ عابد نے بھانپ لیا کہ اس نے سبق یاد نہیں کیا ہوگا اس لیے مولانا نے اتنی سختی سے اس طالب علم کی پیٹھ پر اپنی خوں خوار چھڑی سے بھارت کا جغرافیائی نقشہ بنا ڈالا ہے۔ اپنا انجام سوچ کر عابد کی روح کانپ اٹھی تھی وہ وہیں مجسمے کی طرح کھڑا ہو گیا۔ مولانا نے دوسرے بچوں کو ڈانٹ پھٹکار کر وہاں سے بھگا دیا۔ عابد باقی بچا کھانا کھانے مطبخ واپس آیا۔ وہیں دو بچے ایک گوشے میں کھڑے ہو کر گپ شب کرنے لگے۔ ''ممتاز تو بہت سیدھا سادہ لڑکا ہے۔ مولانا نے کیوں بری طرح اس کی پٹائی کر دی؟ اگر وہ سبق یاد نہیں کر سکا تو یہ کوئی بہت بڑی غلطی تھوڑی ہے''۔ ایک نے بڑے تجسس سے دوسرے سے کہا ''بات سبق کی نہیں'' اس نے اپنے ساتھی کو قریب ہونے کو کہا تاکہ وہ اس کے کان میں کچھ کہہ سکے۔ عابد کے دل میں بھی کھلبلی مچی ہوئی تھی اس لیے وہ بھی کھسک کر ان کے قریب ہی کھڑا ہو گیا۔ ''بات یہ ہے کہ کل رات مولانا کے بار بار بلانے کے باوجود وہ مولانا کی خدمت کرنے نہیں گیا''۔ دوسرا یہ سن کر ہنس پڑا۔

''دیکھا نہیں تم نے کہ کتنی بے رحمی سے مولانا نے اس کی پٹائی کی؟

یہ سراسر غلط ہے۔ مولانا کو اتنی بے دردی سے اس کو نہیں پیٹنا چاہیے تھا''۔

''مگر کون روکے ان کا ہاتھ؟'' ''کوئی نہیں'' دوسرے نے کہا۔

یہ مدرسہ کی زندگی میں عابد کا پہلا تلخ تجربہ تھا۔ خدا کا شکر ہے کہ اس کے استاد ایسے نہیں تھے۔ وہ عابد کی نظر میں بہت اچھے تھے۔ عابد یہ سوچتے ہوئے سونے چلا گیا۔

''اگر میرے ساتھ یہ حادثہ ہوتا تو میں تو نہیں برداشت کر سکتا'' عابد سوچ رہا تھا۔

''اگر ایسا میرے ساتھ ہوا تو میں بھاگ جاؤں گا'' اس نے خود سے کہا۔

وہ بستر پر دراز ہو کر گھر کی یادوں میں کھو گیا۔ اپنی آپا کے بارے میں سوچنے لگا اور گھر جیسی خوشی محسوس کرنے کی کوشش کی۔

حقیقت سے ناواقف ہو کر اس نے سوچا کہ گھر پر سب خوش ہوں گے اور رانی کی شادی کو لے کر اُتاولے ہو رہے ہوں گے۔

''ان کی شادی میں بہر صورت گھر جاؤں گا''۔ اس نے خود سے وعدہ کیا''اس بار مجھے کوئی نہیں روک سکے گا۔ نہ یہ مولانا، نہ ابا اور نہ کوئی اور''۔ وہ گہرے خیالوں میں تھا اس لیے اسے کب نیند آ گئی اس کو احساس تک نہ ہوا۔

ایک لڑکا اس کے کمرے میں آیا اور ایک جھٹکے میں اس کو بیدار کر گیا۔

''ابے او عابد اٹھ! مولانا صاحب تجھ کو اپنے کمرے میں یاد کر رہے ہیں''

عابد مجبوراً اٹھ کر آنکھ مسلتے ہوئے مولانا کے کمرے میں گیا جہاں وہ اپنے بستر پر دراز تھے۔ عابد نیچے ایک چٹائی پر اپنے استاد کے بستر کے قریب بیٹھ گیا۔ مولانا نے لائٹ جلائی اور عابد سے کتاب لا کر سبق سنانے کو کہا۔ عابد ہچکچاتے ہوئے کتاب لے کر آیا اور ایک ہی صفحہ سبق سنا سکا۔ مولانا کا تیور بدلا ہوا تھا۔ اس نے عابد سے فوراً پورا سبق حفظ کرنے کا مطالبہ کیا۔ عابد تھوڑا رنجیدہ ہوا کیونکہ اس پر نیند کا غلبہ تھا۔ مولانا نے باہر جا کر اپنا چہرہ دھلا اور پھر اندر آ کر عابد سے بھی باہر جا کر چہرہ صاف کرنے کو کہا تاکہ غنودگی ختم ہو جائے۔

''کوئی بات نہیں۔ بعد میں یاد کر لینا۔''

مولانا نے یک گونہ دوستانہ ظاہر کرتے ہوئے گفتگو شروع کی۔

''کیا تم کو یہ مدرسہ پسند ہے؟'' مولانا نے پوچھا۔

''جی حضور! لیکن............''

وہ کہتے ہوئے ہچکچا رہا تھا۔

''کسی طرح کی کوئی پریشانی ہو تو مجھے بتاؤ''

مولانا نے شفقتانہ لہجے میں کہا۔

''آج میں نے دیکھا کہ وہ مولانا کس بے رحمی سے ممتاز نامی لڑکے کو پیٹ رہے تھے۔ میں بہت ڈر گیا ہوں حضرت!''۔

آخر اس نے اپنے دل کی بات کہہ دی۔

''فکر نہ کرو۔ تمہارے ساتھ ایسا نہیں ہونے والا۔''

مولانا نے یہ کہتے ہوئے انگلیوں کے اشارہ سے عابد کو بیڈ پر بلایا۔ عابد بیڈ پر بیٹھ کر مولانا کے پاؤں دبانے لگا۔ استاد کے پاؤں دبانا مدرسہ کی روایتی تہذیب ہے اگرچہ مذہب سے اس کا کوئی واسطہ نہیں۔ گفتگو جاری تھی اور مولانا بار بار عابد کے عارض ورخسار کو مَس کیے جا رہے تھے۔ یہ عابد کو کچھ ناگوار سا لگا لیکن مولانا اس کے گال مسلنے سے باز نہیں آئے۔ پھر مولانا صاحب نے لائٹ بجھا دی۔ چند منٹ کے بعد عابد چیختے پکارتے میدان کی طرف بھاگا۔ مولانا نے اس کا تعاقب کیا اور ہاتھ پکڑ کر اس کو متنبہ کیا کہ اگر وہ ممتاز کی طرح پٹائی سے بچنا چاہتا ہے تو فوراً کمرے میں واپس آئے ورنہ یہ نہ بھولے کہ اس نے سبق بھی یاد نہیں کیا ہے۔ عابد باہر پڑی ایک کرسی پر بیٹھ کر آگے کا منصوبہ تیار کرنے لگا۔ اس نے سوچا کہ ساری بات اپنے ابا کو بتا دے مگر پھر چند منٹ کے بعد اس کو وہ بات

یاد آ گئی جو اس کے ابا نے مدرسہ آتے وقت اس سے تلقین کی تھی۔ عابد کو ایسا لگا کہ اس کے ابا اس مولانا کے اندھے مقلد ہیں اس لیے وہ اس کی باتوں کا یقین نہیں کریں گے۔ باہر سخت خنکی تھی اور گھپ اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ بالآخر اس نے واپس مولانا کے کمرے میں جانے کا فیصلہ کیا اور من ہی من میں صبح تڑکے بھاگنے کی ٹھان لی۔ وہ کمرے میں آیا جہاں مولانا بیٹھ کر اس کا انتظار کر رہے تھے۔ مولانا صاحب نے بھانپ لیا کہ وہ لڑکا ان کی نیت بد کو انجام تک نہیں پہنچنے دینے والا ہے۔ ''اس بات کا ذکر مدرسہ کے اندر کسی سے مت کرنا۔ ورنہ یاد ہے نا تمہیں ممتاز کے ساتھ کیا معاملہ پیش آیا؟ تم میرے عزیز ہو اس لیے میں ممتاز کی طرح تمہاری پٹائی نہیں کروں گا مگر یاد رکھو! اگر تم نے کسی کے سامنے اپنی زبان کھولی تو پھر مجھ سے بُرا کوئی نہیں ہوگا۔ تمہارا جینا حرام کردوں گا۔ خاموشی میں ہی تمہاری بھلائی ہے اس بات کا علم تمہارے ابا کو بھی نہیں ہونا چاہیے۔'' مولانا نے اس حادثہ پر پردہ ڈالنے کے لیے عابد کو دھمکایا تاکہ ان کی عزت کا جنازہ نہ نکل جائے۔ عابد نے ہامی میں سر ہلایا اور سونے چلا گیا۔ اگلے دن وہ سب کے ساتھ ایسے پیش آیا جیسے کہ کچھ ہوا ہی نہیں ہے۔ صبح تڑکے اٹھ کر اس نے وضو کیا اور فجر کی نماز کے لیے مسجد گیا۔ وہی مولانا بحیثیتِ امام مقرر تھے۔ اس نے فجر کی نماز پڑھائی۔ نماز سے فارغ ہو کر عابد کتاب اٹھا کر کلاس میں گیا اور باقی ماندہ سبق یاد کرنے لگا۔ دوسرے طلبہ کی زبانوں پر اسی کا چرچا تھا۔ عابد کو دیکھتے ہی انہوں نے اپنی گفتگو بند کردی۔ عابد ان کا موضوعِ سخن سمجھ گیا۔

''رات مولانا سے فیض یاب ہوئے کہ نہیں؟''

ان میں سے ایک نے عابد سے پوچھا اور قہقہے مار کر ہنسنے لگا۔

''تو چپ رہ!''

عابد نے جواباً کہا اور پھر قرآن پڑھنے لگا۔

دوسرے طلبہ آپس میں بات بھی کر رہے تھے اور آگے پیچھے اس طرح ہل رہے تھے کہ گویا وہ اپنے اسباق یاد کرنے میں مشغول ہیں۔

☆☆☆

چھٹا باب

سارے مہمان اب حامد کے گھر سے وداع ہو رہے تھے۔ حامد اپنی زوجہ کے ساتھ باہر دروازے پر بیٹھا ہوا تھا جہاں اس کا بڑا بھائی راشد گاؤں کے چند دوسرے لوگوں کے ساتھ گزشتہ دو دنوں میں ہونے والے واردات پر اظہارِ خیال کر رہا تھا۔

''اللہ کے ہر فعل میں بندوں کے نفع کا راز مضمر ہے''۔

ایک نے دلاسہ دیا۔

''ہاں۔ بالکل حق ہے۔ اگر وہ تمہاری بیٹی کا رشتہ ہی نامنظور کر دیتے تو کتنا بُرا ہوتا۔ ذرا سوچو اگر یہی حادثہ نکاح کے بعد ہوا ہوتا تو کیا ہوتا؟''

دوسرے شخص نے حامد سے اپنی ہمدردی کا اظہار کیا۔

''چلو یہی ہوا۔ ایک اور ضیافت کا موقع ملا۔ اگلی سگائی میں پھر آؤں گا۔ تیرا خدا ہی بھلا کرے میرے بھائی!'' راشد نے تمسخر آمیز مسکراہٹ کے ساتھ کہا اور واپس اپنے گھر چلا گیا۔ حامد کو راشد کی بات ایسی لگی جیسے کسی نے اس کے کان میں سیسہ پگھلا کر ڈال دیا ہو لیکن اس نے پلٹ کر کچھ جواب نہیں دیا کیونکہ حامد ہمیشہ سے اس کی عزت کرتا آیا ہے۔ ایک ایک کر کے سب چلے گئے۔ صرف تین افراد خاموش تماشائی بنے بیٹھے رہے حامد اس کی بیوی اور رانی۔ پھر حامد اپنی بیوی سے مزدوروں کی اجرت اور سجاوٹ کے

بل کی ادائیگی پر گفتگو کرنے لگا۔ ’’کام تو کچھ ہوا نہیں۔ صرف پیسے ضائع ہو گئے‘‘۔ اب حامد رانی کے بیاہ کو لے کر بہت متفکر تھا۔ ’’کون بیاہے گا اس معذور بچی کو؟ خدا نے مجھے ہی کیوں اس آپھت میں ڈال رکھا ہے؟ میں نے تو محنت سے پائی پائی جمع کی ہے۔ خدا اس آپھت کا پھندہ ان لوگوں کے گلے میں کیوں نہیں ڈالتا جو دوسروں کو دھوکہ دے کر دولت مند ہو جاتے ہیں؟ ان کے بچے تو معذور نہیں ہوتے؟ ان کے پلّے اکثر فِٹ اور کھبسورت ہوتے ہیں‘‘۔

حامد خیالوں میں ڈوبا رہا۔

’’کوئی بات نہیں۔ میرا بھی ایک دن آئے گا جب میرا بیٹا مدرسہ کی تعلیم مکمل کر کے اچھی نوکری کرے گا تب لوگ اپنی بیٹیوں کا رشتہ لے کر میرے پاس آئیں گے اور پھر میں ان سے پوچھوں گا کہ تمہاری بیٹی اپاہج ہے کہ نہیں‘‘۔

اس کے ہاتھ پر آنسو کا ایک قطرہ ٹپکا۔

’’دیکھیے تو کون تشریف لا رہے ہیں‘‘؟

رانی کی امّی نے فرطِ انبساط سے کہا۔

’’عابد کی تشریف آوری ہو رہی ہے‘‘

جیسے ہی رانی کے کانوں تک یہ آواز پہنچی وہ بچوں کے مانند خوشی سے جھوم اٹھی۔

مگر حامد خوش نہیں ہوا۔ وہ یہ جاننے کے لیے بیتاب ہو گیا کہ عابد مدرسہ سے کیوں آ گیا۔ کیا وجہ ہو سکتی ہے؟‘‘

’’کیوں آ گیا مدرسہ سے؟ کیا کمی ہو گئی؟‘‘

حامد نے پوچھا۔

’’کچھ نہیں ہوا‘‘ عابد نے غصہ سے کہا۔ اور بیگ و یگ زمین پر پھینک کر رانی

کو دیکھنے لگا۔

''رانی آپا! آپ کی سگائی ہوگئی نا؟۔ چند مہینے میں آپ کی شادی ہوجائے گی پھر میں آپ کے سُسرال آؤں گا اور آپ کے شوہر نامدار میرا استقبال کریں گے۔ میں آپ کے سُسرال میں ہی آپ کے ساتھ رہوں گا پھر وہاں کوئی مجھے تنگ نہیں کرے گا۔''

رانی کی غمزدہ اور سرخ آنکھیں ڈبڈبا گئیں۔

''ہاں'' رانی نے کہا۔

عابد اپنے ماں باپ کا مرجھایا ہوا چہرہ دیکھ کر سمجھ گیا کہ

''کچھ تو ہے جس کی پردہ داری ہے''۔

''کیوں آ گیا تو مدرسہ سے؟'' حامد نے دوبارہ پوچھا۔

''آپ کو نظر نہیں آتا کہ وہ بیچارہ بھر راستہ بھاری بیگ اٹھا کر پیدل آیا ہے۔ وہ تھکا ماندہ ہے۔ چین کی سانس تو لے لینے دیں۔ آپ اپنے سوالات بعد میں پوچھ لیجیے گا۔''

اس کی امی نے مداخلت کرتے ہوئے کہا۔

عابد اپنی ماں سے لپٹ گیا۔ پیار سے چمکارا اور غسل کرنے چلا گیا۔

''لیکن کم از کم یہ تو بتانا ہی چاہیے کہ ہوا کیا ہے۔''

حامد اپنی بیوی کے رویّے سے تھوڑا ناخوش تھا۔

اس رات کھانے کے وقت حامد نے ایک بار پھر پیار سے عابد سے پوچھا کہ

''آخر مدرسہ میں کیا تکلیف ہوئی کہ وہ گھر آ گیا''۔

''اب میں مدرسہ میں پڑھنا تو دور مدرسہ کا منہ تک نہیں دیکھنا چاہتا''۔ عابد نے اپنے والدین کو اپنا فیصلہ سنا دیا۔

''مگر کیوں؟'' اس کی والدہ نے پوچھا۔

''میں نے کہہ دیا نا کہ میں نہیں پڑھنے والا اور نہ ہی یہ بتانے والا کہ کیوں۔
اب مجھے مدرسہ ودرسہ بھی نہیں جانا ہے بس۔ یہی میرا فیصلہ ہے۔''

اس نے کھل کے تو کہہ دیا مگر کوئی علت نہیں بتائی۔

اب اس کے ابا کا تیور بدل گیا۔ اس نے چھڑی نکال کر اس کی پٹائی کر دی۔

عابد رونے دھونے لگا۔

''آپ مجھے جان سے بھی مار دیں۔ تب بھی میں مدرسہ نہیں جانے والا''

عابد نے چلا کر کہا۔

''پھر تم کو ہر روز میرے ساتھ کھیت جانا پڑے گا۔ کرو گے کھیتی باڑی؟''

اس بار حامد کی آواز بلند تھی اور وہ بہت طیش میں تھا۔

''ہاں'' عابد نے جواب دیا اور کھیتی باڑی کرنے کے لیے تیار ہو گیا۔

''کیا یہ تمہارا آخری فیصلہ ہے کہ اب تو پڑھائی لکھائی نہیں کرے گا؟''

حامد نے پوچھا۔

''ہاں'' عابد نے کہا۔

''میں نے تم سے بڑی امیدیں لگائی تھی مگر تم تو نے میری ساری امیدوں پہ پانی پھیر دیا۔ کیا فرق پڑتا ہے۔ جاوید مدرسہ جا کر تعلیم حاصل کرے گا۔ اب وہی ہماری جندگی میں تبدیلی لائے گا۔''

رات اپنی بانہیں پھیلا چکی تھی اس لیے سب اپنے اپنے خوابگاہ میں چلے گئے۔ رانی گھر کے تمام افراد کا بستر لگانے کی ذمہ داری ادا کر کے سونے چلی گئی۔ عابد پیدل چلنے کی وجہ سے تھک گیا تھا اس لیے وہ بھی سو گیا۔ حامد بہت اداس تھا۔ اس لیے کوششوں کے باوجود بھی اس کو نیند نہیں آئی۔

''میں رانی کو اسکول بھیجنے کا سوچ رہی ہوں۔ کیوں کہ سگائی ٹوٹنے کی وجہ سے اس کو کچھ اچھا محسوس نہیں ہو رہا ہوگا۔ اسکول جائے گی۔ اپنی سہیلیوں سے دو باتیں کرے گی تو اس کا جی بہل جائے گا''

رانی کی امّی نے اس کے ابّا سے مشورتاً کہا۔

''تم پاگل ہوگئی ہو؟ یہاں میں اس کے بیاہ کو لے کر پریشان ہوں اور تم کو اس کی پڑھائی سوجھ رہی ہے۔ وہ پڑھ لکھ کر اگر ملازمت حاصل کرنے میں کامیاب ہو بھی گئی تو تمہیں کیا دے گی؟۔ وہ جو کمائے گی سب اس کے شوہر کی تیجوری میں جائے گا۔ تمہیں ایک کوڑی نہیں ملنے والی۔ تو پھر اس کی سکول میں خرچ کرنے کا کیا فائدہ؟ اگر تمہیں سوچنا ہی ہے تو یہ سوچو کہ اس کے ہاتھ پیلے کیسے ہوں گے۔ یہی تمہاری مشکل کا حل ہے۔ آئندہ مجھ سے بے سرو پیر کی باتیں مت کرنا۔ عابد لڑکا ہے۔ اس کی کمائی ہماری اپنی پونجی ہوگی''۔

حامد نے صاف صاف کہہ دیا۔

''میں کوئی تاجر نہیں کہ تمہاری طرح ہمیشہ نفع اور نقصان کا سوچتی رہوں۔ میں ایک ماں ہوں اور ایک ماں اپنے بچوں کو پھلتے پھولتے دیکھنا چاہتی ہے اور بس''۔

اتنا کہہ کر اس کی آنکھیں اشکبار ہوگئیں۔ پھر سب تھکے ہارے سو گئے۔

☆☆☆

ساتواں باب

حامد کے کاندھے پر کھیتی باڑی اور رانی کے بیاہ کا بوجھ تو تھا ہی ۔ ساتھ ہی ساتھ پدرانہ شفقت کے ساتھ عابد اور جاوید کی پرورش بھی کرنی تھی ۔ان تمام الجھنوں کے باوجود وہ تنگ و تاریک جیل کی ہیبت ناک رات اور مچھروں کے ڈنک کو بھلا نہ سکا۔بس یہ کہ بھائی سے انتقام لینے کا لائحۂ عمل اس کے فرضِ منصبی پر غالب نہیں آیا۔اس رات کا خیال آتے ہی فرطِ غضب سے اس کے جسم میں لرزہ طاری ہو جاتا تھا۔رانی کے نکاح کا بندوبست اس کی مجبوری تھی مگر بھائی سے بدلہ چکانا اس کی زندگی کا سب سے بڑا مقصد بن چکا تھا۔اس کی بیوی حامد کے اس بدلے لینے کے گھٹیا رجحان کو لے کر قدرے الجھن میں تھی۔اس لیے جب کبھی حامد کا پارا گرم ہوتا تو وہ اس کو سمجھا بجھا کے ٹھنڈا کر لیتی ۔اس کی چاہت یہ تھی کہ حامد بدلہ کی منصوبہ بندی کو چھوڑ کر رانی کی شادی پر اپنی توجہ مرکوز کرے کیونکہ وہ اس بات سے بخوبی آگاہ تھی کہ انتقام کے چکر میں پڑنے سے گھر کا کوئی فائدہ نہیں ہونے والا۔ اور ویسے بھی وہ ایک ماں تھی اور ظاہر ہے کہ ایک ماں کی نظر میں اس کے بچوں کی آبادکاری سے زیادہ کسی چیز کی اہمیت نہیں۔حامد اور اس کی بیوی جلد سے جلد رانی کو نکاح کے بندھن سے باندھ دینا چاہتے تھے مگر اس معذور لڑکی کے لیے رشتہ نکالنا اب ان کے لیے جوئے شیر لانے کے مترادف تھا۔اب تک تو رانی بھی اس بات سے باخبر تھی کہ اس کا نکاح اس کے

والدین کے سر پر ایک بھاری پتھر کی طرح ہے۔ کسی کے گھر کی مہارانی بننے کے ارمانوں کا خون تو پہلے ہی ہو چکا تھا اور اب اس کے دل میں نئے گھرانے سے کوئی بڑی امید وابستہ نہیں تھی۔ حامد اپنی شریکِ غم کے ساتھ باہر درخت کے سایے تلے بیٹھ کر رانی کی شادی کے متعلق غور و فکر کر رہا تھا۔ تبھی سائیکل پر سوار ہو کر اس مدرسہ کے مولانا وہاں آ کر کھڑے ہو گئے جس مدرسہ میں عابد کا داخلہ کرایا گیا تھا۔ عابد مولانا کو دیکھ کر سہم گیا۔ اس نے سوچا کہ مولانا اس کے ابّا سے ایک دفعہ پھر اس کو مدرسہ بھیجنے کا مطالبہ کریں گے اس لیے عابد وہاں سے فرار ہو گیا۔

پھر علیک سلیک کے بعد مولانا نے دریافت کیا:

''کیسے ہیں آپ حامد صاحب؟ سب بخیر و عافیت تو ہے؟''

''جی ھجرت! سب ٹھیک ہی ہے مگر.........''

حامد نے تاسف بھری آواز میں جواب دیا۔

''کس بات کی فکر ہے حامد صاحب؟ آپ کی شخصیت تو بستی بھر میں محترم و معظم ہے۔ اگر آپ کو کسی بات کی فکر لاحق ہے تو برائے کرم مجھے بتائیں۔ آپ میری نگاہ میں میرے ابّا جیسے ہیں۔ آپ مجھے اپنی تکلیف سے باخبر کریں ہو نہ ہو اس بندۂ پر تقصیر سے آپ کی کچھ مدد ہو جائے''۔

مولانا نے دستِ تعاون دراز کیا۔

''ھجرت! آپ کو تو معلوم ہی ہے کہ میری بیٹی رانی ایک معذور سی بچی ہے۔ اس کی کمی آپ سے ڈھکی چھپی نہیں ہے کون اس لاچار بچی کو اپنی دلہن بنائے گا؟ جیسا کہ آپ کو معلوم ہے کہ میں کوئی بہت بڑا رئیس بھی نہیں ہوں۔ یہی میرا دکھڑا ہے اور میں جانتا ہوں کہ اس کا علاج ہمارے پاس نہیں ہے۔ بس آپ سے درکھاست ہے کہ ہماری پھیملی

کو دعا میں یاد رکھیں"۔

حامد نے یہ سوچتے ہوئے کہا کہ مولانا اس کی مدد کے قابل نہیں ہیں۔

"میرے ذہن میں ایک صاحب ہیں جو آپ کی دخترِ نیک اختر سے عقد کرنے کے لیے راضی ہو سکتے ہیں۔ اگر آپ اجازت دیں تو میں اس رشتہ کو آگے بڑھاؤں؟ وہ آپ کی رفیقۂ حیات کا برادرزادہ ہے۔ نہایت خداترس انسان ہے آپ حیرت میں ہوں گے کہ جب ان کو معلوم ہے کہ میری بیٹی اپاہچ ہے تو کیوں کر وہ نکاح کے لیے راضی ہوں گے۔ دیکھیے وجہ یہ ہے کہ لڑکا عمر کا تیسواں زینہ پار کر چکا ہے اور نکاح کرنے کے لیے اتاولا ہے۔ اس کی عمر ڈھل چکی ہے۔ اب اس کو مناسب رشتہ نہیں ملنے والا۔ کلاہ وریش والا انسان ہے اور نماز کا پابند ہے۔ حاصل کلام یہ کہ اس کا گھرانہ اچھا اور دیندار ہے" مولانا صاحب نے کہا۔

"لیکن اتنی عمر تک وہ کنوارا کیوں ہے"

حامد کی زوجہ نے تجسس سے پوچھا۔

"کیوں کہ ان لوگوں کو ایک نیک سیرت لڑکی کی تلاش تھی جوان کو سید گھرانے میں نہیں مل سکی۔ میرے خیال سے انہیں آپ کی بیٹی بھا جائے گی کیوں کہ وہ بھی پارسا لڑکی ہے۔"

مولانا صاحب نے وضاحت سے کہا۔

"پھر تو بہت بڑا مسئلہ حل ہو جائے گا۔ کیا وہ لوگ جہیز کا بھی مطالبہ کریں گے؟"

حامد نے دریافت کیا۔

"مجھے نہیں لگتا کہ وہ جہیز کا مطالبہ کریں گے۔ ہاں اگر آپ اجازت دیں تو میں پیغام نکاح لیکر جاؤں؟ اور جہیز کے بارے میں ان کی رائے بھی معلوم کرلوں۔"

مولانا صاحب نے جواب دیا۔

''جی! بالکل آپ معاملہ آگے بڑھائیں۔''

حامد اور اس کی بیوی نے بیک زبان ہو کر اشتیاق سے کہا۔

''حضرت! آپ چائے یا کچھ پئیں گے؟''

انہوں نے مزید کہا۔

''جی نہیں۔ شکریہ۔ اگلی دفعہ خدمت کا موقع دوں گا (انشاءاللہ)''۔

مولانا یہ کہہ کر خوشی خوشی وہاں سے رخصت ہو گئے۔

عابد ڈرے سہمے درخت کے پیچھے چھپ گیا تھا۔ وہ مولانا صاحب کو واپس ہوتے دیکھ کر باہر نکل آیا۔ وہ یہ سوچ کر قدرے گھبرایا ہوا تھا کہ اس کے والدین اس کو ڈانٹ ڈپٹ کریں گے کیونکہ یہ تو یقینی ہے کہ مولانا صاحب نے ضرور اس کی برائی کی ہوگی۔

جبکہ معاملہ بالکل برعکس تھا۔

''عابد! کہاں جا رہے ہو میرے ننھے؟ ادھر آؤ پیارے!''

وہ آواز سن کر دم بخود رہ گیا۔

''مولانا صاحب سے کیا بات ہوئی؟'' کیا انہوں میرے تعلق سے کچھ کہا؟''

عابد نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔

''نہیں تو۔ وہ تو رانی کے نکاح کے سلسلے میں بات چیت کر رہے تھے۔ وہ بہت نیک دل انسان ہیں۔''

عابد کی والدہ نے عابد سے کہا۔

''ہاں نیک دل تو وہ یقیناً ہیں۔''

عابد نے طنز آمیز لہجہ میں کہا۔ اس کی ماں نے ہامی میں سر ہلایا کیوں کہ وہ اس کی

آواز میں چھپی طنز کو نہ سمجھ سکی۔ دوسرے دن مولانا صاحب خوش خبری لے کر آئے۔ اور انہیں اطلاع دی کہ وہ لوگ نکاح کے لیے تیار ہیں لیکن اس سے قبل ایک دفعہ لڑکی کو دیکھنا چاہتے ہیں۔

''بے شک! کیوں نہیں؟''

حامد اور اس کی بیوی نے بیک زبان ہو کر کہا۔

''لیکن ہم سگائی کی تقریب میں نہیں پھنسنا چاہتے۔ اگر رانی ان کو بھا گئی تو ہم نکاح کی تاریخ متعین کر لیں گے۔''

حامد نے کہا۔

''واہ! کیا خوب اتفاق ہے۔ ان کی بھی یہی خواہش ہے۔''

''لڑکا کیا کرتا ہے؟''

''وہ دوائی کی دکان چلاتے ہیں۔ جس کے مالک ان کے ابا ہیں۔ وہ تین بھائی ہیں۔ سب سے بڑے بھائی کے نکاح کو ایک سال ہو چکا ہے اور عنقریب ان کے یہاں ایک بچے کی ولادت ہونے والی ہے''۔

مولانا صاحب نے اس کو اطلاع دی۔

''یہ تو بہت اچھی بات ہے۔''

''کیا آپ اس گھرانے کے بارے میں مزید معلومات فراہم کر سکتے ہیں؟''

حامد کی بیوی نے عرض کیا۔

''ان کے والد کبھی رامپور کے زمیندار ہوا کرتے تھے۔ مگر تقسیم ہند کے دوران انہوں نے پاکستان ہجرت کرنے کا فیصلہ کیا۔ پاکستان میں بیس سالہ زندگی گزارنے کی وجہ سے انہوں نے بہت ساری زمین جائداد کھو دیا اور آخر کار ہندوستان واپس آنے کا فیصلہ کیا۔ اسی ایک

لڑکے کی پیدائش پاکستان میں ہوئی اور جب وہ واپس آئے تو دیکھا کہ ان کے ہمسایوں اور رشتہ داروں نے ان کی تمام جائداد پر قبضہ کر لیا تھا اور کسی بھی صورت میں لوٹانے کے لیے تیار نہیں تھے۔ اس لیے لڑکے کی ماں نے ان کے رہنے بسنے کے لیے جان توڑ کوشش کی مگر ان کی بیوی کی زندگی نے وفا نہ کیا اور وہ چل بسی۔ اس طرح ان کو دوسری شادی کرنی پڑی۔ انہوں نے دوبارہ ایک زمیندار لڑکی سے نکاح کیا۔ اس نے کچھ زمین فروخت کر کے ان کو ایک میڈیکل اسٹور کھلوا دیا تا کہ ان کا گزارا ہو سکے۔ اب وہ دوسروں کے کھیت بٹائی پر لے کر کھیتی باڑی کرتے ہیں اور ان کے بیٹے اسٹور چلاتے ہیں۔ مولانا صاحب نے تفصیل سے بتایا۔

☆☆☆

آٹھواں باب

رانی کے ساتھ جس لڑکے کے نکاح کی بات چیت چل رہی تھی اس کا نام رضا تھا۔ اس کا ایک بڑا بھائی تھا جس کا نام مجیب ،ایک چھوٹا بھائی جس کا نام رضوان اور عطیہ نامی ایک سوتیلی ماں تھی۔اس کے ابا کا نام ڈاکٹر سید تھا جنہیں بستی کے لوگ ڈاکٹر صاحب پکارتے تھے۔ڈاکٹر صاحب کے پاس کوئی میڈیکل یا پی۔ ایچ۔ڈی کی ڈگری نہیں تھی۔ بلکہ ماضی میں وہ چند طبیبوں کے ماتحت رہ کر کچھ چھوٹے بڑے نئے امراض کے علاج ومعالجے سے واقف ہو گئے تھے۔اور دوائیوں کی جانکاری کی بنیاد پر انہوں نے اپنی دوسری بیوی کے پیسوں کے بل بوطے پر اپنے بیٹے کے لیے میڈیکل اسٹور کھول دیا تھا۔ ڈاکٹر صاحب بستی کے مریضوں کے مسیحا تھے۔ ڈاکٹر صاحب ایک نہایت راسخ العقیدہ مسلمان تھے اور اسلام کی تعلیمات پر سختی سے عمل پیرا تھے اس لیے انہوں نے کبھی کسی کو دھوکہ نہیں دیا۔یہ الگ بات ہے کہ وہ خود کئی مرتبہ دوسروں کے دامِ فریب میں پھنس گئے۔ پاکستان سے آنے کے بعد ان کے دل میں رشتے داروں اور محلے کے لوگوں کی محبت دوبالا ہو گئی تھی۔انہوں نے اپنی زندگی میں بے شمار نشیب وفراز کا تجربہ کیا تھا۔بچپن میں ہی ان کے والد کا سایہ سر سے اٹھ گیا تھا۔ان کی والدہ ایک استانی تھیں۔ انہوں نے بڑے لاڈ پیار سے ان کی پرورش کی تھی۔ان کو اپنے آبا واجداد سے وراثت میں بڑی بڑی زمینیں

ملی تھیں جس کی وجہ سے ان کا گھرانہ بہت مضبوط تھا اور یہ گھرانہ معاشرہ میں دولت مند تسلیم کیا جاتا تھا۔ مگر پاکستان ہجرت کر کے وہ اپنی تمام جائداد سے ہاتھ دھو بیٹھے تھے۔ چونکہ وہ ایک تعلیم یافتہ گھرانے کے فرزند تھے اس لیے انہوں نے ہمیشہ اپنے بال بچوں کو پڑھانے لکھانے کی کوشش کی مگر وہ اپنی زندگی کے تگ ودو میں ایسے پھنسے کہ وہ اپنی اولاد کو دسویں کلاس سے زیادہ کی تعلیم نہ دے سکے۔ ان کے باوجود وہ ہمیشہ اپنے بچوں کے سامنے تعلیم کی معنویت واہمیت پر روشنی ڈالتے رہتے۔ اس لیے تعلیم کی اہمیت ان کے رگ وپے میں سماگئی اور وہ روزی روٹی کمانے کے ساتھ ساتھ تعلیم حاصل کرنے کی بھی کوشش میں لگے رہے۔ ڈاکٹر صاحب ہنس مکھ تو تھے ہی اس پر ان کی بڑی بڑی آنکھیں۔ چہرے پر لمبی سفید داڑھی کا نور اور سر پر سجی رہنے والی ٹوپی کا تاج ان کی انفرادی شخصیت کے نمایاں خدوخال تھے۔ پنج وقتہ نماز کے ایسے پابند تھے کہ کوئی نماز قضا نہیں ہوئی اور استقلال کے ساتھ مذہبی اجتماعات میں شریک ہوتے۔ باپ کی خوبیاں بیٹوں کو بھی وراثت میں ملی تھیں۔ بالخصوص رضا تو ان کا عکس کامل تھا۔ اگرچہ مجیب دولت جمع کرنے کے نشے میں تمام حدود پار کر لینا چاہتا تھا تاہم رضا اپنے حدود سے آگے کبھی نہیں بڑھا۔ رضوان کو اپنے ابا کے ساتھ رہنے کا کچھ خاص موقع نہیں ملا اس لیے وہ ان کی خصلتوں اور خوبیوں کو حاصل کرنے سے رہ گیا۔ ہاں وہ سماجی طور پر بڑا متحرک تھا۔ تینوں بھائیوں کی اپنی دلچسپی کے مطابق الگ الگ ذمہ داریاں تھیں۔ رضوان کے سپرد کھیتی باڑی کے امور تھے۔ جبکہ رضا دکان کی باگ ڈور سنبھالے ہوئے تھا۔ تینوں بھائیوں نے مل کر اقلیت طبقہ کے لیے ایک اسکول کا افتتاح کیا تھا۔ مجیب اس اسکول کو صوبائی حکومت سے الحاق کرانے کے لیے جان توڑ کوشش کر رہا تھا اس لیے اکثر اوقات وہ باہر ہی ضلع اور شہر کا چکر لگاتا رہتا تھا۔ ڈاکٹر صاحب کی نگاہ میں ان کے بیٹوں کی شادی سے زیادہ ان کے کریئر کی اہمیت تھی۔ جب بیٹے ان کی

امیدوں پر کھرے نہیں اترے تو انہوں نے ان کی شادی کرادینے کا فیصلہ کیا مگر اب کافی دیر ہو چکی تھی اور اب اپنے بیٹوں کو رشتۂ ازدواج سے جوڑنے کے لیے ڈاکٹر صاحب کو ان تھک کوششیں کرنی تھیں۔

رضا کے لیے رانی سے زیادہ مناسب اور کوئی رشتہ نہیں مل سکتا تھا۔ اس پر مستزاد یہ کہ ایک معذور لڑکی کو نکاح میں لانا ثواب اور نیکی کا کام تھا۔ ڈاکٹر صاحب نے اس پیغام نکاح کے سلسلے میں اپنے بیٹوں سے بات چیت کی اور پھر اس رشتہ کو منظور کرلیا۔ وہ نکاح کے سلسلے میں بہت زیادہ پیسے بہانے کے قائل نہیں تھے۔ اس کی وجہیں تھیں۔ ایک یہ کہ فضول خرچی کے لیے ان کے پاس پیسے نہیں تھے دوسری وجہ یہ تھی کہ اسلام میں فضول خرچی کی اجازت نہیں۔ ڈاکٹر صاحب مولانا کے ہمراہ حامد کے گھر گئے۔ چونکہ حامد کی زوجہ ان کے رشتے میں بہن ہوتی تھی اس لیے ان کو کچھ زیادہ تفتیش کی ضرورت نہیں پڑی۔

"بلا کسی غیر ضروری اخراجات کے اس مبارک تقریب کا انعقاد میں مسجد میں کرنا چاہتا ہوں۔"

ڈاکٹر صاحب حامد کی بیوی سے مخاطب ہوئے۔

"ہم بھی ایک کوڑی کی فضول خرچی نہیں چاہتے۔ آپ کی طرح ہم بھی اس کام کو سادگی سے نپٹانا چاہتے ہیں۔ مگر میں چاہتا ہوں کہ محلے کے چند لوگ اور میرے تمام بھائی اس تقریب میں شامل رہیں۔"

حامد نے اپنی بیوی کی طرف سے جواب دیا۔

"جی ٹھیک ہے۔ آپ دن، تاریخ متعین کردیں۔ اور وہاں آپ کے آئے گئے کو شامل کر کے دس لوگوں سے زیادہ باراتی کی ضرورت نہیں ہے۔ اور شادی پڑھانے کا کام یہیں مسجد میں امام صاحب کردیں گے۔ اس کے بعد آپ سب کے استقبال میں ہم بھوج

کریں گے پھر رانی وداع ہو جائے گی اور ہمیشہ کے لیے آپ کے گھرانے کی ہو جائے گی"۔

حامد کی بیوی نے اپنی رائے کا اظہار کیا۔

ادھر یہ میٹنگ جاری تھی ادھر راشد یہ جاننے کے لیے بے قرار تھا کہ حامد کے یہاں کیا ہو رہا ہے اس لیے وہ بھی وہاں آن پہنچا۔ جیسے ہی اس کی نگاہ ڈاکٹر صاحب پر پڑی وہ اندر آ گیا اور اس نے ڈاکٹر کا پُر تپاک خیر مقدم کیا۔

"رائے ڈاکٹر صاحب! حالات کیسے ہیں؟ بڑے دنوں کے بعد زیارت ہوئی۔"

راشد نے معاملے کی تہہ تک پہنچنے کے لیے بے حد احتیاط سے کہا۔

"اچھا ہوا آپ کے بڑے بھائی بھی آ گئے۔ ان کی رائے کے بنا کچھ فائنل نہیں ہو سکے گا۔"

ڈاکٹر صاحب نے ایسا راشد کی دلجوئی کے لیے کہا۔ پھر انہوں نے راشد کو میٹنگ کے بارے میں سب کچھ بتا دیا۔ راشد نے جواب میں مسکرا دیا۔

"بھیا! آپ کے بچار میں کون سی تاریخ اچھی رہے گی؟"

حامد نے شرافت سے پوچھا۔

"تم نے کیا سوچا ہے؟"

"ہم نے اب تک متعین نہیں کیا ہے۔"

"جمعرات کے بارے میں کیا خیال ہے؟ آج سے ٹھیک پندرہ دن رہ گئے ہیں۔ اور پھر جمعہ کے دن ہم ولیمہ کا بھوج کر لیں گے۔"

"یہ تو بہت اچھی رائے ہے۔"

ڈاکٹر صاحب خوشی خوشی متفق ہو گئے۔

’’چلیے تو پھر بات پکی سمجھی جائے۔تمہارا کیا کہنا ہے حامد؟‘‘

راشد نے پوچھا۔

’’آپ جو بھی طے کریں اس میں میرا اتفاق ہے۔‘‘

حامد نے نرمی سے کہا۔

’’ڈاکٹر صاحب! کیا اس رشتہ کے متعلق آپ نے اپنے فرزند رضا کی رائے معلوم کی ہے؟‘‘

راشد نے یہ پتہ لگانے کے لیے پوچھا کہ یہ رشتہ ہر کسی کے اتفاق سے ہو رہا ہے یا نہیں۔

’’میرا مطلب یہ ہے کہ وہ رانی کے حال سے بیگانہ تو نہیں؟

راشد نے مزید کہا۔

’’ان سب کے بارے میں سوچنے والا وہ کون ہوتا ہے؟۔ میں اس کا باپ ہوں۔ اس کی اچھی بری چیزوں کو میں جانتا ہوں۔ بلاشبہ وہ میرے حکم پر سرِ تسلیم خم کرے گا۔ اس نے کبھی میرے فیصلے پر اگر مگر نہیں کیا۔‘‘

’’پھر تو بہت اچھی بات ہے۔‘‘

’’حامد! چلو مٹھائی لاؤ۔ رانی کی شادی متعین ہوگئی۔‘‘

راشد نے حامد کو یوں حکم دیا جیسے ان کے درمیان کسی طرح کی کوئی بداتفاقی نہ ہو۔ سماجی سطح پر یہ ضروری بھی ہوتا ہے۔ کیوں کہ لوگ ایسی فیملی میں رشتہ کرنا پسند نہیں کرتے جن میں آپسی اختلافات ہوں۔ اس لیے انہوں نے کبھی اجنبی لوگوں کو اپنے اختلافات کی بھنک بھی نہیں لگنے دی۔ حامد نے عابد کو آواز لگائی۔ وہ ڈرے سہمے آیا۔ اس کے ذہن میں اب بھی یہی بات تھی کہ ہو نہ ہو مولانا نے ابا سے میری شکایت کی ہوگی۔ مگر جب اس نے

اپنے ابا کو ہنستے مسکراتے دیکھا (جو شاید باید ہی ہوتا ہے) تو قدرے راحت محسوس کی۔

''جاؤ۔ ایک کلو لڈو لے آؤ''

اس نے عابد کو حکم دیا۔

خوش خبری کے اعلان کے لیے لڈو بہت مشہور مٹھائی ہے۔ عابد کو یہ جاننے میں زیادہ وقت نہیں لگا کہ ضرور کوئی نہ کوئی خوشخبری ہے۔ پھر محلے میں لڈو تقسیم کیا گیا۔ پندرہ دن کے بعد نکاح ہو گیا۔ رانی اتنی مایوس تھی کہ اس کے لیے یہ بھی تسلیم کرنا دشوار تر تھا کہ اس کی شادی ہو رہی ہے۔ حامد بہت خوش تھا کیونکہ وہ اپنی سب سے بڑی ذمہ داری سے ہمیشہ کے لیے سبکدوش ہونے جا رہا تھا۔ بس اس کی یہی خواہش تھی کہ کسی طرح معاملہ خیر سلا کر کے انجام کو پہنچ جائے۔ جب جب اس کی نظر راشد پہ پڑتی اس کا زخم ہرا ہو جاتا۔ جیل کی اس مہیب رات کو وہ کیسے بھول سکتا تھا۔ حامد کا ایجنڈا یہ تھا کہ ایک دفعہ اللہ اللہ کر کے رانی کی شادی ہو گئی پھر تو راشد سے بدلہ لینا ہے۔

رانی کے بچپن کی تمام سہیلیاں اس کے ساتھ تھیں۔ اس کے مزے لے رہی تھیں۔ اس کو ہنسانے کی کوشش کیں مگر وہ اپنے حال پر قائم رہی۔ ایسا لگ رہا تھا کہ وہ اس احساس میں ڈوبی ہوئی ہے کہ یہ سہیلیوں کے ساتھ اس کا آخری دن ہے اور آج کے بعد سے وہ ایک نئی زندگی کا آغاز کرنے جا رہی ہے۔ اس کی پلکوں پر کوئی ایسا خواب نہیں سجا تھا کہ کوئی شہزادہ گھوڑے پر سوار ہو کر آئے گا اور اسے اپنی دنیا کی شہزادی بنا کر لے جائے گا جیسا کہ اس نے قصۂ اطفال میں سن رکھا تھا۔ وہ تنہائی چاہتی تھی۔ سکون سے بیٹھنا چاہتی تھی۔ وہ اپنی اماں سے بات کرنا چاہتی تھی مگر وہ تو بہت مصروف تھیں۔ وہ ابا کو دیکھنا چاہتی تھی۔ وہ اپنے والدین سے ڈھیر سارے سوالات کرنا چاہتی تھی کہ آخر سماج میں کسی لڑکی کو ایسی سزا کیوں دی جاتی ہے کہ والدین کی محبت اور شفقت کے سایے تلے پلتی بڑھتی ہے

اور پھر اچانک ماں، باپ، بھائی، بہن سے جدا ہو کر پرائے گھر کی ہو جاتی ہے۔ آخر کیوں کسی لڑکی کو پرائے گھر جانا پڑتا ہے جہاں ایک خاص قسم کے ماں، باپ اور دیگر افراد اس کا استقبال کرتے ہیں اور پھر چار و نا چار اس پرائے گھر میں رین بسیرے کرنے پڑتے ہیں؟ کیا حشر ہوگا اگر اس کو وہ گھرانہ پسند نہ آئے یا اگر اس فیملی کو وہ لڑکی پسند نہ آئے۔؟

ایسا نہیں ہے کہ رانی ان سوالات کے جوابوں سے بیگانہ تھی بلکہ اس کو معلوم تھا کہ ایک لڑکی کے سسرال والے اس کے من مطابق ہوں یا نہ ہوں بہر صورت لڑکی کو خود ان کے ہم آہنگ ہونا پڑتا ہے۔ ہندوستان میں لڑکیوں کی قسمت کا یہی رونا ہے۔ رانی کو اپنے سوالات اپنے دل کے تہہ خانوں میں دفن کرنے پڑے۔ بہر حال ماں تو ماں ہوتی ہے۔ وہ اپنے بچے کا چہرہ دیکھ کے اس کر دل میں مچلتے ہوئے ارمانوں کا اندازہ آسانی سے لگا لیتی ہے۔ وہ رانی کے جذبات کو محسوس کر سکتی تھی اور کیوں نہ ہو وہ خود ان مراحل سے گزر چکی ہے۔ اس نے رانی کا چہرہ دیکھا جہاں آنسوؤں کا ایک سمندر مچل رہا تھا۔ دونوں نے خاموش رہ کر ایک دوسرے کے جذبات کو بآسانی سمجھ لیا۔ روایتی طور پر نکاح سے سات روز قبل دلہن کی سہیلیاں اور دیگر عورتیں ابٹن لگانے کی رسم ادا کرنے کے لیے دلہن کے گھر جمع ہوتی ہیں۔ دلہن کے چہرے اور جسم پر ابٹن لگاتے وقت عورتیں روایتی گیت گاتیں ہیں۔ ابٹن ایک خوشبودار مسالہ ہے جو جسم کو چمکدار اور ملائم بنانے کے لیے مَلا جاتا ہے۔ عورتیں دل لگی میں کبھی دلہن کا مزہ لیتی ہیں اور کبھی دولہے کا مذاق اڑاتی ہیں۔ اس دوران ہونے والی رنگ رلیوں کا کوئی برا نہیں مانتا۔ ان تمام مراحل سے رانی کو بھی گزرنا پڑا۔ ان ایام میں دلہن کو کام کاج سے بھی فرصت دے دی جاتی ہے۔ ایسا ہی نوشہ کے گھر بھی ہوتا ہے۔ رانی نہ تو بہت خوش تھی اور نہ زیادہ غمگین۔ ادھر رضا بہت اتاؤلا ہو رہا تھا۔ یہ جاننے کے باوجود کہ اس کی ہونے والی شریکِ حیات اپاہج ہے وہ اپنی رفیقۂ حیات سے ملنے کے لیے بے چین تھا۔

سماجی طور پر نکاح سے قبل منگیتر سے ملاقات کرنا نامناسب تصور کیا جاتا ہے۔ وہ اپنی شریکِ حیات سے تو نہ مل سکا مگر اس نے اپنی نوخیز اور زہرہ جمال سالی لیلیٰ کو دیکھنے کو جوگاڑ لگالیا۔ ''یہ تو حسن کی ملکہ ہے۔ جب رانی کی چھوٹی بہن اتنی بھولی بھالی ہے پھر تو یقیناً رانی بھی حسن ودلکشی کا مجسمہ ہوگی''۔ رضا نے دل ہی دل میں قیاس کیا۔ شدید اسلامی رسم ورواج کی وجہ سے ان دنوں تصویروں کی ادلا بدلی کی کوئی روایت نہیں تھی۔ اب زمانہ بدل چکا ہے۔ رانی کے ابّا اور اس کے بڑے بھائی نے شربت پلا کر بارات کا استقبال کیا۔ دولہے کا چہرہ جالی دار سہرا سے ڈھکا ہوا تھا۔ وہ سفید کرتا اور پاجامہ میں ملبوس تھا۔ ہلکے ناشتے کے بعد محلے کے لوگوں کو مسجد میں منعقد نکاح کی تقریب میں شرکت کی دعوت دی گئی۔ مولانا نے عربی زبان مین خطبہ ٔ نکاح پڑھا۔ پھر اس نے دولہے سے پوچھا

''اَقبِلتَ ؟ (کیا آپ نے رشتہ قبول کیا؟)''

''نعم ! قَبِلتُ'' (ہاں ! میں نے قبول کیا) دولہے نے کہا۔

پھر مجمع نے دعا کے لیے ہاتھ اٹھایا۔ دعا کے اختتام کے بعد لوگوں نے حامد اور اس کے نئے داماد کو مبارکبادیاں پیش کیں۔ بارات نے رات میں دلہن کے گھر ایک کیمپ کے اندر قیام کیا۔ اگلی صبح رانی کی رخصتی کے وقت گھر کے اندر عوتوں کے رونے کی آواز گونجنے لگی۔ عورتیں ایک ایک کر کے رانی کو گلے سے لگا کر رونے لگیں۔ درحقیقت یہ ایک رواج تھا۔ اگر واقعی میں کسی کا دل ماتم کر رہا تھا تو وہ رانی کی ماں تھی کیوں کہ اس کو معلوم تھا کہ اس کے جگر کا ٹکڑا رانی اب کسی اور گھر کے لیے وداع ہو رہی ہے۔ آج کے بعد سے وہ اپنے ہی گھر میں پرائی ہو جائے گی۔ ایک دراز قامت شخص جس نے چھوٹی چھوٹی داڑھی رکھ رکھی تھی نے آگے بڑھ کر ڈاکٹر صاحب سے معانقہ کیا اور بڑی گرم جوشی سے مبارکباد پیش کی۔ ڈاکٹر صاحب تھوڑے اچنبھے میں پڑ گئے کیونکہ یہ وہی آدمی تھا جس نے ایک دن ان

کے یہاں جا کر حامد کی برائی کی تھی۔ اس نے ڈاکٹر صاحب سے حامد کی چغلی کھائی تھی کہ حامد نرا گھٹیا انسان ہے اور دونوں بھائیوں کے تعلقات بہت برے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب کی حیرت تو اس وقت دوبالا ہوگئی جب وہ شخص حامد سے ایسے ملا جیسے کہ وہ حامد کا عزیز دوست ہو۔ اور جیسے کہ حامد نے ہی شادی کی پارٹی میں اس کو مدعو کیا ہے۔ وہ کوئی اور نہیں چاند میاں تھا۔ ''یہ لمبوترا! کون ہے؟''۔

''وہ راشد بھائی کا یار چاند میاں ہے''

''اچھا!''

''کیوں؟ کیا بات ہے؟''

''نہیں کچھ نہیں...... کچھ دنوں پہلے میرے پاس آ کر اس نے بڑی کوشش کی کہ میں اس شادی کے لیے ہاں نہ کروں۔ مگر میں نے اس کی باتوں پر کان نہیں دھرا''۔

''جی...... وہ اسی قسم کا آدمی ہے۔ جب خوشیاں کسی کے دروازے پر دستک دیتی ہیں تو وہ حسد کی آگ میں جلنے لگتا ہے۔''

حامد نے کہا۔

''ہاں وہ تو مجھے معلوم ہے۔ میں تو بس یہ تعجب کر رہا تھا کہ اس کو کس نے دعوت دی ہے؟''

''میں نے اس کو دعوت نہیں دی ہے۔''

حامد نے کہا۔

''دعوت تو میں نے بھی اس کو نہیں دی۔'' ڈاکٹر صاحب نے واضح طور سے کہا۔

چاند میاں فوراً وہاں پہنچ گیا۔ اور کباب میں ہڈی بنتے ہوئے بول پڑا ''سمدھیوں کے بیچ کیا راز کی باتیں ہو رہی ہیں؟''

''نہیں کچھ نہیں۔ ہم تو بس یہ کہہ رہے تھے کہ سب کچھ خیر سلا سے انجام کو پہنچ گیا''
حامد نے بات چھپانے کی کوشش کی۔

''تم نے ٹھیک کہا'' چاند میاں۔ گویا ہوا۔

''میں نے سوچا ہو سکتا ہے مجھے یہاں دیکھ کر تمہیں تعجب ہو رہا ہوگا۔ تو میں تمہیں بتا دوں کہ تمہارے بڑے بھائی جو میرے جگری دوست ہیں انہوں نے اپنی بھتیجی کے نکاح میں مجھے مدعو کیا ہے۔ مجھے معلوم ہے تم یہی سوچ رہے ہو گے کہ مصروفیت کی وجہ سے تم مجھے دعوت دینا بھول گئے۔ فکر کی چنداں ضرورت نہیں ہے۔ میں تم سے ناراض نہیں ہوں۔ میں بھی جانتا ہوں کہ شادی بیاہ میں تمام طرح کی الجھنیں ہوتی ہیں ایسے میں ہر کسی کو ذہن میں رکھنا دشوار ہوتا ہے۔ میں تو تمہارے گھر کا ہی ایک فرد ہوں۔ اور کہیں کوئی اپنے گھر کے ہی کسی فرد کو دعوت دیتا ہے؟''

چاند میاں نے دوست جیسا بن کر بات چیت کی۔ ''آپ نے درست فرمایا'' ڈاکٹر صاحب نے احتراماً کہا۔ اصل میں گھر کے آدمی کو اتنا تو حق ہے ہی کہ وہ دوسروں کو پوچھ سکیں۔ ان کو کارڈ وارڈ کی کوئی ضرورت نہیں''۔

حامد نے اضافہ کیا۔

''بس اسی وجہ سے میں نے تمہاری اجازت کے بغیر کسی کو دعوت دی ہے۔ میں جانتا تھا تم کو کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔

نہیں ہوگا نا؟''

چاند میاں نے ان دونوں سمدھیوں سے پوچھا۔ یہ سن کر دونوں سکتے میں آ گئے کیوں کہ ان کو معلوم تھا کہ چاند میاں ضرور کوئی نہ کوئی مصیبت کھڑی کرنے جا رہا ہے۔

''جناب! تشریف لائیں۔''

اس نے مجمع میں سے کسی کو آواز لگائی۔
سفید کرتا پاجامہ میں ملبوس ایک شخص مہمانوں کے درمیان سے باہر آیا۔ وہ بہت موٹا اور مسٹنڈا تھا۔ اس کی مونچھیں ڈراؤنی تھیں۔ پان چباتے ہوئے جیوں ہی وہ قریب آیا اس نے دیوار پر نہایت مکروہ انداز میں پان تھوک دیا۔ جب وہ قریب آیا حامد کی نگاہیں بڑی آسانی سے اس کو پہچان گئیں۔ یہ وہی پولس افسر تھا جو حامد کو جیل لے گیا تھا اور بے رحمی کے ساتھ اذیت ناک سزائیں دی تھیں۔ اس کو دیکھ کر حامد سہم سا گیا مگر اس سے پہلے کہ حامد کچھ کہتا وہ افسر بول پڑا:

"گھبراؤ نہیں۔ میں تمہیں جیل لے جانے نہیں آیا۔ اصل بات یہ ہے کہ چاند میاں ہمارے بڑے اچھے مِتر ہیں۔ انہوں نے مجھے بتایا کہ ان کی بھتیجی کا بیاہ ہونے والا ہے اور تم اس بٹیا کے پِتا ہو۔ پھر میں نے سوچا کہ چل کے تمہاری بٹیا کو آشر واد دے آؤں۔

ارے ڈاکٹر صاحب! کیسے ہیں آپ۔ اب آپ تو ہمارے مہمان ہوئے۔ کسی طرح کی کوئی کشٹ ہو تو مجھے بتائیں۔ میں اس چھیتر کا پولس افسر ہوں۔ اب بٹیا کے وِواہ میں آیا ہوں تو وردی میں تھوڑی آؤں گا۔ حامد میرا ایک اچھا دوست ہے۔"

پولیس افسر نے ایک ہی سانس میں سب کچھ کہہ ڈالا۔ حامد کو ایسا لگا کہ کسی نے مجمع عام میں اس کو زوردار طمانچہ جڑ دیا ہو اور وہ ذلت ورسوائی کے سمندر میں غوطہ زن ہو گیا ہو۔ مگر (ماحول کی نزاکت کی وجہ سے) وہ کچھ جواب نہ دے سکا۔

"یہ چاند میاں بھی نا بڑا بے ڈھنگا انسان ہے۔ اس پولس افسر رام پاٹھک کو نکاح کی تقریب میں بلانے کی کیا ضرورت تھی؟ میں نے اس احمق چاند میاں کو دعوت دے کر غلطی کی ہے۔" راشد حامد کے کان کے پاس جا کر بڑبڑایا۔ اس سے نگاہیں ملائی اور طنزیہ انداز میں مسکراتے ہوئے وہاں سے کھسک گیا۔ حامد کو ایسا لگا کہ کسی نے اس کے زخم پر نمک

چھڑک دیا ہو۔

راشد سے انتقام لینے کی آگ جو تقریباً بجھ چکی تھی ایک مرتبہ پھر سلگ اٹھی۔ اس نے راشد کی طرف غصہ بھری نگاہ سے دیکھا۔

اب بارات روانگی کی تیاری کر رہی تھی۔ خواتین دلہن کو رخصتی کے لیے تیار کر چکی تھیں۔ چاند میاں اور رام پاٹھک ایک کونے میں بیٹھ کر چائے پی رہے تھے۔ چاند میاں نے حامد کو بلا کر پوچھا: ''تم راشد سے صلح کیوں نہیں کر لیتے؟ لڑائی سے کوئی فائدہ نہیں ہونے والا۔ ایک کام کرو۔ وہ زمین کا ٹکڑا اس کو لوٹا دو جو اس کے دعویٰ کے مطابق اسی کی ہے۔ اس چھوٹی سی زمین کے لیے بار بار جیل جانا عقلمندی نہیں ہے۔ آج کل قانونی لڑائی کی مہنگائی آسمان چھو رہی ہے۔ قانونی جنگ کی قیمت اس زمین سے بھی زیادہ ہے۔ تمہاری کیا رائے ہے؟''

''میں سوچ کر بتاؤں گا''

حامد نے اتنا کہا اور بارات کی رخصتی کے انتظام و انصرام میں مشغول ہو گیا۔ چند منٹ کے بعد راشد نے رام پاٹھک سے پوچھا۔

''کیا ہوا؟''

''ابھی تک تو کچھ نہیں''

چاند میاں نے اس کے بدلے (اس کی چمچا گیری کرتے ہوئے) جواب دیا۔

آخرکار بارات کی روانگی کا سماں آ ہی گیا۔ ڈاکٹر صاحب، نوشہ بابو رضا، نوشہ کے بڑے بھائی مجیب اور رضوان سب نے آگے بڑھ کر حامد اور اس کی فیملی کو الوداع کہا۔ انہوں نے ایک ایک کر کے سب سے مصافحہ کیا جن میں راشد، رام پاٹھک اور چاند میاں بھی شامل تھے۔ اپنی صاحبزادی کو دلہن کے جوڑے میں دیکھ کر حامد کی آنکھیں ڈبڈبا گئیں اور رکے

ہوئے آنسو یکا یک ابل پڑے۔ حامد کی بیوی، عابد، لیلیٰ، جاوید اور رانی کی تمام ہم جولیاں سب کے سب مجسمۂ غم واندوہ بنے ہوئے تھے۔ اپنے اپنے ہاتھوں کو ہلا کر رانی کو الوداع کہہ رہے تھے اور رانی کی بہتر ازدواجی زندگی کے لیے ہاتھ اٹھا کر رب سے فریاد کر رہے تھے۔

رانی خوشی اور غم کا سنگم بنی ہوئی تھی۔ وہ خوش اس لیے تھی کہ اب وہ نکاح کے بندھن سے بندھ گئی تھی اور غمگین اس لیے تھی کہ وہ اپنوں سے جدا ہو رہی تھی۔

☆☆☆

نواں باب

بارات واپس قاضی نگر آ گئی۔ رضا کے رشتے داروں نے رانی کا پرتپاک خیر مقدم کیا اور پھر رانی کو حجلہ عروسی میں آرام کرنے کے لیے بھیج دیا گیا۔ ڈاکٹر صاحب محلے والوں کے درمیان شیرینی تقسیم کرنے میں مصروف ہو گئے۔ اگرچہ رانی کے گاؤں اور قاضی نگر کے درمیان فقط بیس کلومیٹر کا فاصلہ تھا پھر بھی وہ تھک سی گئی تھی۔ اگلی صبح مجیب اور ڈاکٹر صاحب نے رضا کو دیوان خانہ میں طلب کیا۔ یہ دیوان خانہ گھاس پھوس کا بنا ہوا تھا۔ ڈاکٹر صاحب نے اپنے تینوں بیٹوں کو بالعموم اور رضا کو بالخصوص مخاطب کرتے ہوئے کہا

''ہم اپنی فیملی کے ساتھ راضی خوشی زندگی بسر کر رہے ہیں۔ بستی میں بارہا دیکھا گیا ہے کہ جب کبھی کسی فیملی میں کوئی عورت نئی نویلی دلہن بن کر آتی ہے تو وہ آپسی بھائی چارہ کے بندھن کو توڑنے کی کوشش کرتی ہے۔ لہذا وفاداری کے ساتھ رہو اور اپنی بیوی کی کسی ایسی بات پر کان مت دھرو جو اس خاندان میں باہمی نفرت کا سبب بنے۔ میں ہمیشہ تم تینوں بھائیوں کو متحد دیکھنا چاہوں گا۔ اگر تم نے اتحاد کا دامن تھامے رکھا تو زندگی کی بڑی بڑی جنگ کامیابی کے ساتھ سر کر سکو گے۔ خیال رہے کہ کوئی تمہارے درمیان نفرت کا بیج نہ بو سکے۔ اگر مستقبل میں کوئی اختلاف رونما ہو تو تینوں ایک ساتھ ہو کر اس کا حل تلاش

کرنے کی کوشش کرو۔

ان باتوں کو تم سب ذہن نشین کر لو'۔

تینوں نے ڈاکٹر صاحب کی باتوں سے اتفاق ظاہر کی۔ پھر ڈاکٹر صاحب نے تینوں بھائیوں کے ساتھ مجیب کی اہلیہ شینخو اور رانی کو بھی گھر کے اندر طلب کیا۔ اور نصیحت کرنے لگے

''دو عورتیں جہاں ہوتی ہیں وہاں اختلاف و باہمی مخاصمت کا پایا جانا یقینی ہے لیکن اگر دونوں ایک دوسرے کے لیے قربانی دینا سیکھ لیں تو پھر زندگی بڑی آسان ہو جاتی ہے۔''

دونوں عورتیں پردہ کیے ہوئے احترام سے اپنی آنکھیں جھکائے بیٹھی ڈاکٹر صاحب کی نصیحت سن رہی تھیں۔

یہ گاؤں کی تہذیب کا حصہ تھا کہ جب گھر کا سربرآوردہ شخص کچھ کہتا تو اس کے آگے کسی کو کچھ بولنے کی جرأت نہ ہوتی۔ اسی تہذیب کی وجہ سے ان دونوں کو ڈاکٹر صاحب کی ہر بات پر آمناً صدّقنا کہنا پڑا۔

''گھر کے اندر کے کام کاج آپس میں بانٹ لو۔ مثلاً صفائی ستھرائی کا سارا کام شینخو کر لے اور کھانے پکانے کی ذمہ داری رانی سنبھال لے یا اس کے برعکس جو تم دونوں کو مناسب معلوم ہو۔

آخر یہ سب تمہیں دونوں کو کرنا ہے۔

جب تک شگفتہ حمل سے ہے رانی کو حتی المقدور کوشش کرنی ہوگی اور شینخو کی تمام ضروریات پر رانی کو بھرپور توجہ دینی ہوگی۔

''کیا تم اس بات سے اتفاق کرتی ہو؟''

ڈاکٹر صاحب نے بڑی شائستگی سے رانی سے دریافت کیا۔

''جی ماموجان!''

رانی نے ہامی میں کہا۔

رانی اپنے سُسر کو ماموں پکارتی تھی کیوں کہ وہ اس کی والدہ کے ماموں زاد بھائی تھے۔رانی بیچاری چوں کہ اپاہج تھی اس لیےاس کے لیے جھاڑو لگانا بڑادشوار کام تھا پھر بھی وہ ہمیشہ نہایت ستھرائی سے جھاڑو لگاتی۔ مائیکے میں محنت کر کر کے اس کو جانفشانی کرنے کی عادت ہو چکی تھی۔ ادھر صبح کی سپیدی رات کی تاریکی کوالوداع کہتی ادھر رانی بستر کوالوداع کہہ دیتی۔گھر کے کسی بھی فرد کے بیدار ہونے سے قبل ہی وہ صفائی ستھرائی کے کام کاج سے فارغ ہو کر ناشتہ تیار کرنا شروع کر دیتی۔ گھر کے افراد بیدار ہوتے تو رانی کو پکاتی ہوئی پاتے۔رانی ناشتہ تیار کر کے ایک پلیٹ شینخو کے کمرے میں رکھ آتی۔ پھر وہ آلاتِ مطبخ صاف کرتی اور دوپہر اور رات کا کھانا پکانے میں مصروف ہو جاتی۔ دن بھر یہی سلسلہ جاری رہتا۔ سورج غروب ہونے تک وہ تھک کے چور ہو جاتی۔ یہ سلسلہ اس وقت تک جاری رہا جب شینخو نے ایک بھولا سا منّا جنم دیا۔ بچے کی ولادت سے پورے گھر میں خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ ادھر رانی بھی حمل سے ہوگئی۔ مجیب کے باپ بننے سے گھر کا ماحول خوشی کے رنگ میں رنگ گیا۔ ادھر رانی کے پیر بھاری ہونے کی خبر سے سب کی خوشیاں دوبالا ہو گئیں۔ رانی چونکہ پولیو کی مریضہ تھی۔ ایسی حالت میں اثباتِ حمل کی امید کم ہوتی ہے۔ حامد اور اس کی اہلیہ یہ خوش خبری سن کر مچل گئے۔ اور پھر رانی کے گھر آ کر اپنی بچی سے ملاقات کی۔ رانی اور اس کے اہلِ خانہ کو مبارکباد پیش کی۔ اب چونکہ رانی امید سے تھی۔ ایسے میں گھر کے کام کاج کرنا اس کے لیے نہایت دشوار تھا۔ اور چونکہ جب شینخو حمل سے تھی تو رانی نے اس کی جم کے خدمت کی تھی۔ اب شینخو کی باری تھی کہ ویسا ہی برتاؤ وہ رانی کے ساتھ کرے۔ مگر رانی کی امیدیں خاک میں مل گئیں۔ اس کو اب بھی گھر کا سارا کام کرنا پڑتا

اور خود اپنا خیال بھی رکھنا پڑتا۔ایک دن اس نے اپنی تکلیف سے اپنے شوہر نامدار کو باخبر کیا مگر وہ اس کی باتوں کو سننے کے لیے تیار ہی نہیں تھا۔اس کے کانوں میں اس کے والد کی نصیحت کا وہ جملہ اب بھی گونج رہا تھا کہ ’’عورت ہمیشہ گھر کے اتحاد کو توڑنے کی کوشش کرتی ہے۔‘‘

’’میرے خیال سے ایک لٹر دودھ تمہارے لیے اور میرے بھتیجے کے لیے کافی ہونا چاہیے۔‘‘

رضا نے رانی سے کہا۔

’’اللہ میاں گواہ ہیں۔اس دودھ میں سے مجھے ایک بوند بھی نہیں ملتا۔

پورا دودھ شیخو اپنے بچے کے ساتھ مل کر چٹ کر جاتی ہے۔‘‘

رانی غمناک ہو کر بولی۔

’’یہ سب مجھ سے مت کہو۔تمہاری بات ناقابلِ اعتماد ہے۔میری بھابھی ایسا نہیں کر سکتی۔وہ ظالمہ تھوڑی ہے‘‘۔

رضا نے جواب دیا۔

’’تو پھر آپ یہ مانتے ہیں کہ پورا ایک لٹر دودھ بچہ اکیلے پی جاتا ہے؟‘‘

رانی نے کہا۔

’’ہمارے رشتے میں دراڑ پیدا کرنے کی کبھی کوشش مت کرو!

ہم ایک ساتھ تھے اور ایک ساتھ رہیں گے۔اس طرح کی احمقانہ شکایتیں ہمارے اتحاد کو توڑ سکتی ہیں اور ہم میں سے کوئی نہیں چاہتا کہ کبھی ایسا ہو۔سمجھی؟‘‘

رضا نے رانی کو جھڑک دیا اور چلا گیا۔

شیخو نے چوری چوری ان کی گفتگو سن لی اور اپنے شوہر کے کان بھرنے لگی۔لیکن اس

نے مجیب کو کہانی کا ایک ہی پہلو بتایا۔ اپنی خامیوں پر پردہ ڈال گئی۔

مجیب اپنے کمرے سے باہر نکلا اور مردوں والے کمرے میں داخل ہوگیا جہاں وہ سب دوپہر کے کھانے کے انتظار میں بیٹھے ہوئے تھے۔ مجیب غصے سے لال پیلا ہو رہا تھا اور رضا کے آنے کا انتظار کر رہا تھا تا کہ اس منظر نامے پر گفتگو کا آغاز ہو۔

رضا اپنی بیوی کی بات سن کر تھوڑا مغموم ہوا مگر پھر چند لمحے بعد ان باتوں کو بھول گیا۔ وہ یہ سوچ رہا تھا کہ اس مہینہ دکان کے کرایے کی ادائیگی کا وقت ہو گیا ہے۔ اس لیے وہ یہ جاننا چاہتا تھا کہ کرایہ کل تیرہ تاریخ کو ادا کرنا ہے یا آئندہ مہینے کی ساتویں تاریخ کو۔ رات میں کھانا کھاتے وقت اس نے مجیب سے کہا

"مجھے آپ سے کچھ ضروری بات کرنی ہے"

رضا اس سے کرایہ کے متعلق گفتگو کرنا چاہتا تھا۔

مجھے خوب معلوم ہے تم کیا بات کرنا چاہتے ہو۔ تم اس کے متعلق بات کرنا چاہتے ہو جو تمہاری بیوی نے تم سے بات کرنے کو کہا ہے۔ تم یہی کہنا چاہتے ہو نا کہ میری بیوی کیوں پورا دودھ پی جاتی ہے اور شیر خوار بچے کو نہیں دیتی۔ ایک بات تو بالکل واضح ہے کہ اس کو میرے بچے سے حسد ہے کیونکہ وہ خود اب تک بے اولاد ہے۔"

مجیب نے ایک ہی سانس میں اپنے دل کی بھڑاس نکال دی۔ وہ غصے سے آگ بگولا ہو رہا تھا۔

"نہیں بھائی جان! ایسی کوئی بات نہیں......"

اس سے پہلے کہ رضا اپنا جملہ مکمل کرتا مجیب ایک بار پھر برس پڑا۔ "اگر تم اس خوش فہمی میں مبتلا ہو کہ اس گھر میں صرف تم ہی وہ تنہا شخص ہو جس کی کمائی سے گھر چل رہا ہے تو تمہاری سوچ بالکل غلط ہے۔ تمہارے دکان میں بیٹھنے کا یہ مطلب تھوڑی ہے کہ میں

اور رضوان ہاتھ پہ ہاتھ دھرے بیٹھے رہتے ہیں۔ گھر کے ہر فرد کے حقوق برابر ہیں۔ نہ کسی کو کم نہ کسی کو زیادہ۔ سمجھے؟

مجیب نے رضا کو تقریباً ڈانٹتے ہوئے کہا۔

رضا تھوڑا غمزدہ ہوا کیونکہ یہ اس کی زندگی کا پہلا حادثہ تھا جب اس کا بھائی اس پر اتنا ناراض ہوا تھا۔

رضا یہ سوچ رہا تھا کہ ضرور اس کی بیوی نے یا تو مجیب سے کوئی شکایت کی ہے یا پھر اس کی بھابھی کو کچھ کہا ہے۔ اس دن رضوان بھی اس سے سیدھے منہ بات کرنے کو تیار نہیں تھا۔

رضا اپنے کمرے میں داخل ہوا جہاں اس کی بیوی صفائی پکائی سے تھکنے کے بعد آرام کی سانسیں لے رہی تھی۔ کمرے کے باہر برآمدے کے ایک گوشے میں کچن تھا جہاں شینو برتن باسن صاف کرنے میں مشغول تھی۔

''تم نے کچھ کھایا پیا کہ نہیں؟'' رضا نے دریافت حال کیا۔

''نہیں''

''کیوں''

''کھانے کو کچھ بچا ہی کہاں ہے۔''

''کیا؟ کھانا کیسے ختم ہو گیا؟''

''مجھے نہیں معلوم۔'' رانی کا لہجہ تھوڑا سخت تھا۔

رضا اس کے جواب میں کچھ کہہ نہ سکا اور چپ چاپ سونے چلا گیا۔

دیر رات بڑی تاخیر سے ڈاکٹر صاحب اپنے کام سے واپس آئے۔

صبح ناشتے کے وقت انہوں نے اپنے صاحبزادوں سے دریافت کیا ''سب کچھ

ٹھیک تو ہے نا؟''

''جی ہاں'' رضا نے کہا۔

''کچھ ٹھیک نہیں ہے۔'' رضوان نے جواب دیا۔

''کیا معاملہ درپیش آیا ہے؟'' ڈاکٹر صاحب نے تفتیش کی۔

''گھر کی نئی دلہن نے ہمارے درمیان نفرت بیج بونا شروع کر دیا ہے۔''

مجیب نے کہا۔ مزید برآں یہ کہ رضا کو بھی اپنے جال میں پھانس چکی ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ میری وائف کام چور ہے اور وہ اس کے حصے کا کھانا بھی چرا لیتی ہے۔ اس کا یہ بھی کہنا ہے کہ اس کے ساتھ ہمارا برتاؤ ٹھیک نہیں ہے۔ رضا بھی اس کی باتوں میں آ گیا ہے۔''

''نہیں......نہیں....نہیں تو۔ میں نے تو کچھ بھی نہیں کہا ہے''

رضا نے قطع کلامی کرتے ہوئے کہا۔

''بنیادی مسئلہ تو یہی ہے کہ تم نے کچھ نہیں کہا ہے۔ تمہیں اپنی جورو کو کچھ تو کہنا ہی چاہیے تھا۔ لیکن تم کہہ کیسے سکتے ہو۔ تم تو جورو کا غلام ہو۔ درحقیقت تم اور تمہاری جوری مجھ سے میری وائف سے اور میرے نوزائیدہ بچے سے حسد کرتے ہو۔ بولو کہ ایسا نہیں ہے؟''

رضا اور ڈاکٹر صاحب دونوں ہی مجیب کے طریقۂ کلام اور اندازِ گفتگو سے آئینۂ حیرت بنے ہوئے تھے۔

''بات یہ ہے کہ رضا نے یہ سوچ رکھا ہے کہ وہ دکان چلاتا ہے اور ہم دونوں بھائی نکمے بیٹھے رہتے ہیں۔ یہ سچ ہے کہ تم دن بھر دکان چلاتے ہو اور یہ بھی سچ ہے کہ میں اسکول کو ریاستی حکومت سے الحاق کرانے میں جان توڑ کوششیں کر رہا ہوں جو فیملی کے فائدے کے لیے ہے۔ اور رضوان بھی خون پسینا بہا کر کھیتی باڑی کرتا ہے۔'' مجیب نے مزید کہا۔

رضا اپنے بڑے بھائی کے برتاؤں سے حیرت میں ڈوبا جارہا تھا۔ ڈاکٹر صاحب فورا سمجھ گئے کہ ان دونوں بھائیوں کا اب ساتھ رہنا ممکن نہیں ہے۔ ڈاکٹر صاحب چوں کہ اپنے والد کے اکلوتے بیٹے تھے اس لیے ان کو بھائیوں کی لڑائی کا کوئی تجربہ نہیں تھا۔ ایک چیز جو ڈاکٹر صاحب آسانی سے کرسکتے تھے وہ یہ کہ دونوں بھائیوں کا کاروبار الگ الگ کردیں تاکہ دونوں سکون سے روزی روٹی کما اور کھاسکیں۔ وقت برق رفتاری سے گزر رہا تھا۔ رانی باوجود اس حقیقت کے کہ وہ امید سے تھی محنت وجانفشانی سے گھریلو کام کاج کرتی رہی۔ اس نے یہ خواب دیکھ رکھا تھا کہ اس کا شوہر اس کے حقوق کے لیے لڑے گا۔ اور یہ کہ جب شیخو کے ایام حمل میں اس نے شیخو کو گھر کا ایک کام تک چھونے نہیں دیا تھا تو شیخو بھی اس کی مدتِ حمل میں اس کی وفاداری کا صلہ وفا سے دے گی۔ مگر وقت کی رفتار ہی اس کے خلاف تھی۔ نہ تو اس کے سرتاج نے اس کی پریشانیوں کا حل نکالا اور نہ شیخو نے رانی کی قربانیوں کا کوئی بدلہ دیا۔ حمل کے ساتویں مہینے میں اس کو احساس ہوا کہ اس کی تقدیر کے کسی صفحے میں خوشی نام کی کوئی چیز نہیں لکھی گئی ہے۔ وہ گھر کی تمام ذمہ داریوں کو حسبِ معمول ادا کرتی رہی۔ کھانے پینے کو جو کچھ بھی مل جاتا وہ اس کو غنیمت جان کر کھالیتی اور مطمئن ہوجاتی۔ آخر کار اس نے فیصلہ کرہی لیا کہ اگر اس کی مشکلات سے ہی اس گھر کے لوگ امن وشانتی میں ہیں تو وہ راضی خوشی ان پریشانیوں کو جھیلنے کے لیے تیار ہے۔ اس کے بعد اس نے اپنے شوہر کے سامنے کبھی ایک حرف شکایت کے لیے لب کشائی نہیں کی۔ ایک دن اچانک اس کو شکم میں زور کا درد محسوس ہوا اور وہ غش کھا کر زمین پر گر پڑی۔ شیخو اپنے کمرے سے باہر نہیں نکلی ۔ چند منٹ کے بعد جب رضا گھر آیا تو اپنی بیوی کو اٹھا کر اپنے کمرے میں لے گیا اور پھر اس کے چہرے پر پانی کا چھڑکاؤ کیا۔ جس سے وہ ہوش میں آگئی۔ اب وہ درد سے کراہ رہی تھی ۔ تب جا کر شیخو اس کے کمرے میں آئی اور یوں

گویا ہوئی: ''اتنا سا درد تو مدت حمل میں ہوتا ہی رہتا ہے۔ جب میں وہاں تھی ہی تو اس کو کام کرنے کی کیا ضرورت تھی؟

دراصل یہ خود کو محنتی باور کرانا چاہتی ہے۔ خیر یہ دَرد وَرد کوئی بڑی بات نہیں ہے۔ مدت حمل میں یہ سب ہوتا ہی رہتا ہے۔''

اتنا کہہ کر شیخوا اپنے کمرے میں چلی گئی۔

''تم نے کچھ کھایا ہے؟'' رضا نے اپنی زوجہ سے دریافت کیا۔

''نہیں۔ میں نے نہیں کھایا۔''

''کیوں؟''

''کچن میں ایک دانہ بھی نہیں بچا ہے''

''کیوں؟''

''میں نہیں جانتی''

''اللہ تمہیں تمہارے نیک اعمال کا بدلہ عطا کرے گا۔'' اس نے کہا اور اپنی بیوی کو صبر کی تلقین کی۔

''انصاف اب اللہ ہی کے ہاتھ میں ہے'' وہ اپنے آنسوؤں کو جذب کرتے ہوئے بولی۔ دونوں نے ایک دوسرے کو محبت بھری نگاہ سے دیکھا۔

''اگر تم کچھ کھانا چاہو تو میں پڑوس سے ایک دو روٹی مانگ لاؤں؟''

وہ بغیر کچھ جواب دیے برآمدہ صاف کرنے چلی گئی۔ صفائی کے دوران وہ ایک بار پھر غش کھا کر گر گئی۔ رضوان نے رضا کو اطلاع دی۔ پھر رانی کو اٹھا کر کمرے میں لے آئے جہاں رانی ہوش میں آئی۔ پھر اس نے بتایا کہ اس کے شکم میں ناقابل برداشت درد ہو رہا ہے۔

ڈاکٹر صاحب فوراً سمجھ گئے کہ کوئی معمولی سادرد نہیں تھا۔ ڈاکٹر صاحب کے علم میں اگلی بستی میں ایک عورت ہے جو اس بلاک کے گورنمنٹ اسپتال میں ایک ماہر امراض نسواں ڈاکٹر کی ماتحتی میں کام کرتی ہے۔

وہ آئی اور مریضہ کو ایک نظر دیکھنے کے بعد اس نے ڈاکٹر صاحب کو بتایا کہ وہ صبح سے بھوکی ہے اس لیے کمزوری کا احساس ہو رہا ہے۔ وہ ایک پولیو زدہ عورت ہے اور پولیو زدہ کے لیے ماں بننے کی امید بہت کم ہوتی ہے۔ عام طور پر تو ایک پولیو زدہ عورت حاملہ ہی نہیں ہو سکتی۔ اس کا حاملہ ہونا کسی معجزہ سے کم نہیں ہے۔ ایسی نازک حالت میں بہتر یہ ہے کہ اس کو کسی اسپتال میں اچھے ڈاکٹر کی نگرانی میں رکھا جائے۔

ڈاکٹر صاحب نے بھانپ لیا کہ اسپتال وسپتال کا چکر بڑا مہنگا پڑے گا اس لیے مناسب یہی ہے کہ اس کو اس کے مائیکے بھیج دیا جائے۔ جہاں اس کے والدین اس کی نگرانی اور دیکھ بھال کریں گے۔

رضا اپنی بیوی کے ساتھ سسرال کے لیے روانہ ہو گیا۔

ڈاکٹر صاحب دروازے کے باہر کہیں پختہ جگہ بیٹھ کر نیم کا مسواک کر رہے تھے۔ انہوں نے سنا کہ شینخوا اپنے آپ بڑبڑا رہی تھی۔

''کیا میں کوئی ڈائن ہوں؟ بھلا میں کھانا کیوں چھپاؤں؟ میں جب سے اس گھر میں بیاہ کے آئی ہوں میں نے سب کا خیال رکھا ہے۔ میرے ماں باپ ہی اندھے تھے کہ انہوں نے مجھے ایک جاہل خاندان کے بھینٹ چڑھا دیا۔ اس گھر میں میری شادی کرا کے انہون نے میری زندگی برباد کر ڈالی۔'' یہ سب کہہ کر وہ رونے لگی۔ ''میرا قصور کیا ہے؟ یہی کہ میں نے ایک بچہ جنم دیا ہے جو اس گھر کا سب سے بڑا کہلائے گا۔ یہ لوگ حسد کی آگ میں جل رہے ہیں۔ اور سارا الزام میرے سر دھر رہے ہیں۔ اس

کی جسمانی کمزوریوں کی ذمہ دار بھی میں ہی ٹھہری۔ میں نے تھوڑی مشورہ دیا تھا کہ رضا کی شادی کسی لنگڑی لولی لڑکی سے کر دی جائے۔ یہ تو سب کے مشورے سے ہوا تھا۔ اور اب اس کا خمیازہ بھگت رہے ہیں۔''

شیخو نے مزید کہا۔ وہ خود سے ہی ہم کلام تھی۔ وہ اس سے بھی بیگانہ نہیں تھی کہ ڈاکٹر صاحب باہر بیٹھے ہیں اور کسی کی باتیں سن رہے ہیں۔

ڈاکٹر صاحب کو یہ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ ایسی حالت میں کیا کرنا چاہیے۔ وہ بیچارے خاموش تماشائی بنے بیٹھے رہے۔

☆☆☆

دسواں باب

مائیکے جاتے وقت راستے میں رضا اور رانی کو پہلی دفعہ کھل کر گفتگو کرنے کا موقع ملا۔

''خیال رہے کہ تم مجھے میری جان سے بھی زیادہ عزیز ہو مگر یہ میری فیملی ،میرے ابا جان ،میرے بھائی۔ یہی میری زندگی کا کل سرمایہ ہیں۔ میں ان کی مرضی کے خلاف قدم نہیں اٹھا سکتا۔ وہ جو کچھ بھی کرتے ہیں اس میں میری بھلائی کا راز پوشیدہ ہوتا ہے۔ میں تو ان کے لیے جان بھی دے سکتا ہوں۔ نہ جانے کیوں تمہارے ساتھ ان کا برتاؤ ٹھیک نہیں ہے۔'' دبے لفظوں میں رضا نے معذرت طلبی کی کوشش کی۔

''میں بتاتی ہوں آپ کو حقیقت کیا ہے'' رانی نے کہنا شروع کیا۔

''آپ کے مطابق آپ ان کے عزیز ہیں۔ لاڈلے ہیں۔ ہوسکتا ہے آپ اپنی سوچ میں راست پر ہیں۔ مگر جہاں تک میں سوچتی ہوں تو مجھے لگتا ہے کہ وہ نہیں چاہتے کہ کوئی ان سے بھی زیادہ آپ کو پیار کرے۔ شاید اسی بنا پر وہ مجھے ناپسند کرتے ہیں۔ آپ کے علاوہ صرف آپ کے ابا ہی ہیں جن کی شفقت کا ہاتھ میرے سر پر سایہ فگن رہتا ہے۔ ان کو سمجھنا چاہیے کہ اگر آپ ان کے پیارے ہیں تو میں بھی کوئی غیر نہیں۔ ہم دو جسم ایک جان ہیں۔ جب تک آپ میرے ساتھ ہیں مجھے کوئی غم نہیں۔ وہ آپ کو چاہتے ہیں۔ چاہیں۔ کوئی حرج کی بات نہیں۔ مگر مجھے دھڑکا سا لگا رہتا ہے کہ کہیں وہ آپ کو مجھ سے چھین

نہ لیں۔ اگر ایسا ہوا تو یہ میری زندگی کا سب سے سیاہ باب ہوگا۔'' رانی نے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ جیسے ہی تانگا نے جھٹکا لیا یکایک رانی کو کچھ درد سا محسوس ہوا۔ رضا نے فوراً تانگا رکوایا اور قریب ہی ایک گھر سے پانی لا کر رانی کو پلایا۔ یہ کوئی ہموار سڑک نہیں تھی بلکہ نہر کی باندھ تھی جس سے آمدورفت کا کام لیا جاتا تھا۔ رضا نے اس کو پانی پلایا اور پھر تانگے سے اٹھا کر قریب کے ایک اجنبی کے یہاں ایک کھاٹ پر لٹا دیا۔ کھاٹ گھر کے باہر لگی ہوئی تھی۔ صاحبِ خانہ نے ان کے ساتھ بڑی ہمدردی کا سلوک کیا۔ اس کی بیٹی نے دو کپ گرم گرم چائے سے ان کی مہمان نوازی بھی کی۔ ان دونوں کی گفتگو کا سلسلہ جاری رہا۔

''آپ کا کیا حال ہے؟ اپنا ہونے والا ننھا مُنا کس کی شکل وشباہت کا ہوگا؟'' رانی نے رضا سے بڑے اشتیاق سے پوچھا۔

''میرے خیال سے اس کی شکل وشمائل تم سے ملتی جلتی ہوگی۔ کیونکہ تم خوبصورت ہو۔'' رضا نے بشاشت سے جواب دیا۔

''لیکن میں چاہتی ہوں کہ سیرت وخصلت میں وہ بالکل آپ جیسا ہو۔ ایک مکمل دیندار، صداقت کے سانچے میں ڈھلا ہوا اور تھوڑا سا خوبرو بھی''

رانی اپنا شکم سہلاتے ہوئے بولی۔

''اچھا؟ خوبرو بھی؟'' رضا نے کہا اور پھر دونوں کھلکھلا کر ہنس پڑے۔ اس کے بعد دونوں تانگے میں سوار ہوئے اور چل پڑے۔

اب رضا کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی۔ اس نے اپنی بیوی کو اتنا خوش پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ پہلی دفعہ اس کو احساس ہوا کہ رانی اس کو دل وجان سے چاہتی ہے۔ یہ اور بات ہے کہ اس نے پہلے کبھی اپنے جذبات کا اظہار نہیں کیا۔

''مجھے پتہ ہے آپ کس خیال میں ڈوبے ہوئے ہیں؟'' رانی اس کے کاندھے پر ہاتھ مار کر اس کو خیالوں کی دنیا سے باہر لے آئی۔

''ہاں تو پھر بتاؤ کہ میں کس خیال میں ڈوبا ہوا ہوں؟''

''آپ اپنے ہونے والے شہزادے کا نام سوچ رہے ہیں۔ صحیح کہا نا میں نے؟''

''ہاں........تم نے صحیح کہا۔''

اب کچھ ہی لمحے میں رانی کے گاؤں کی سرحدان کی نگاہوں کے سامنے ہوگی۔ رضا سے نکاح کے بعد پہلی دفعہ وہ اپنے مائیکے جا رہی تھی۔ رضا بھی رانی کی فیملی، اس کی سہیلیوں اور اہل وعیال سے ملنے کا مشتاق تھا۔

جب تانگا حامد کے دروازے پر جا کر لگا۔ محلے کے تمام بچوں نے تانگے کو چاروں طرف سے گھیر لیا۔ عابد، جاوید اور پیاری لیلیٰ سب دوڑ آئے۔ اپنی آپا جان کو دیکھ کر سب کا چہرہ خوشی سے کھل اٹھا۔ جب رضا نے رانی کو تانگے سے نیچے اتارنے کی کوشش کی تو حامد نے بھی آگے بڑھ کر ہاتھ بٹایا۔

انہوں نے بھانپ لیا کہ رانی کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ رانی کی امی رانی کو کمرے کے اندر لے گئی۔ اور آرام کرنے کو کہا۔ پھر حامد، اس کی بیوی اور رضا سب کمرۂ ملاقات میں بیٹھ کر بات چیت کرنے لگے۔

''خیر، خیریت سب ٹھیک تو ہے نا؟'' حامد نے دریافت کیا۔

''جی! بالکل ٹھیک ہے۔ دراصل دواخانے کی وجہ سے میرے لیے کہیں آنا جانا دشوار ہو جاتا ہے۔ اس لیے میں آپ لوگوں سے ملنے نہیں آ سکا۔''

''کیا رانی کو اب تک ڈاکٹر کے یہاں نہیں لے گیے؟''

''نہیں اب تک نہیں لے جا سکا۔ میرے گھر میں کسی کو فرصت نہیں تھی۔

بڑے بھائی کو پٹنہ جانا پڑا۔ رضوان تو کسی کام کا نہیں ۔ رہے ابّا تو ان کو اپنے کاروبار سے ہی چھٹی نہیں۔ اس لیے میں نے سوچا آپ لوگ اس کی بہتر دیکھ بھال کریں گے۔'' رضا نے جواب دیا۔

''ہاں بیٹا! تم نے صحیح فیصلہ لیا ہے۔ کل صبح ہم لوگ رانی کو ڈاکٹر کے یہاں لے جائیں گے۔ دیکھیں ڈاکٹر کیا صلاح مشورہ دیتے ہیں۔ بڑی بات یہ ہے کہ تم بھی ہمارے ساتھ رہو گے۔'' رانی کی امی نے کہا۔

''دراصل آج رات میں یہاں نہیں ٹھہر سکتا۔ مگر میں وعدہ کرتا ہوں کہ جیسے ہی مجھے فرصت ملے گی میں آپ سب سے ملاقات کرنے ضرور آؤں گا۔''

رضا نے یہ کہہ کر معذرت طلب کی۔

''اچھا بیٹا! جیسی تمہاری مرضی'' رانی کی امی نے رخصت کی اجازت دے دی۔

سفر سے واپسی کے دوران رضا ایک بار پھر خیالوں میں ڈوب گیا۔ ''اگر میں بیٹے کا باپ بنا تو گھر میں سب خوش ہوں گے۔ لیکن اگر اس کے بیٹی تولّد ہوئی تو ہوسکتا ہے میرے گھر والے اس کو قبول نہ کریں اور پھر اس غم سے رانی بھی ٹوٹ کے بکھر جائے گی۔ اللہ ہی کو معلوم کہ اس کی گود میں کون آنے والا ہے۔ جیسا کہ وہ عورت کہہ رہی تھی، کہیں وہ دردِزہ برداشت نہ کرسکی اور اسی حالت میں اس نے بچے کی پیدائش سے پہلے ہی دم توڑ دیا.........نہیں۔ ایسا نہیں ہوسکتا۔ نہ جانے میرے ذہن میں بُرے خیالات ہی کیوں آرہے ہیں؟۔ مجھے تو ابھی اچھی چیزوں کے بارے میں سوچنا چاہیے۔ مثلاً اس کی گود میں ایک چاند کا ٹکڑا آئے گا اور میرے گھر کا ہر فرد اس کی ولادت کی خوشی سے جھوم اٹھے گا۔'' یکے بعد دیگرے نئی نئی آرزوئیں اور امنگیں اس کے ذہن ودماغ میں مچلتی رہیں اور وہ کب باقر گنج سے قاضی نگر پہنچ گیا اس کو احساس بھی نہیں ہوا۔ جب وہ قاضی نگر پہنچا اس وقت شام

اپنی سیاہ چادر پھیلا چکی تھی۔ وہ اپنے کمرے میں داخل ہوا اور وضو کے لیے پانی طلب کی۔ آج پہلی دفعہ اس کو احساس ہوا کہ کس طرح اس کی زندگی اس کی شریکِ حیات پر منحصر ہو چکی تھی۔ جب اس کو کوئی جواب نہیں ملا تو اس نے خود لوٹا اٹھایا اور پھر پانی لے کر وضو بنایا اور مسجد چلا گیا۔ مسجد سے واپس آ کر وہ باہر مردوں کی نشست گاہ والے کمرے میں گیا۔ جو بالکل سناٹے کی آغوش میں تھا۔ اس کو وہاں کسی کی آہٹ تک محسوس نہیں ہوئی۔

''کون ہے؟ رضا ہے کیا؟'' اندھیرے کے درمیان سے ڈاکٹر صاحب کی آواز گونجی۔

''اندھیرے میں بیٹھ کر کیا کر رہے ہو؟ باقی اور سب کہاں گئے ہیں؟''

''پتہ ہے آج وہ کمرہ اتنا تاریک کیوں ہے؟ حقیقت یہ ہے کہ آج تمہاری بیوی نہیں ہے تو کسی اور کو لالٹین جلانے کی توفیق نہیں ہوئی۔''

''شینخو بھابھی کہاں ہیں؟ ان کو تو لالٹین جلانا چاہیے تھا۔ کوئی بات نہیں۔ میں ہی جلائے دیتا ہوں۔''

رضا یہ کہہ کر لالٹین لے آیا۔ لالٹین کا شیشہ صاف کرنے لگا۔ اس دوران اس کے ابا یوں گویا ہوئے ''تم نہایت زیرک ہو۔ ہمیشہ یاد رکھو کہ زندگی میں ہر موڑ پر دو راستے ملیں گے۔ بھلے راستے کی پہچان نہایت آسان ہوتی ہے۔ سچائی کا راستہ دیکھنے میں دشوار گزار اور بے نتیجہ معلوم ہوتا ہے۔ جیسا کہ غلط راستہ دیکھنے میں پھولوں سے بھرا معلوم ہوتا ہے۔ اس راستے میں کانٹوں کا نام و نشان تک نہیں ہوتا۔ اور اگر ہو بھی تو وہ کانٹے اتنے نرم و نازک معلوم ہوتے ہیں کہ ان پر آسانی سے چلا جا سکتا ہے۔ یہ نظر کا دھوکہ ہے۔ اگر تم نے غلط راہ روی اختیار کی تو تمہاری دنیا و آخرت دونوں برباد ہو کر رہ جائیں گے۔''

ڈاکٹر صاحب رضا کو نصیحت کر کے وہیں قریب پڑی چارپائی پر دراز ہو گئے۔ ڈاکٹر صاحب

خود بھی تھکے ماندے تھے۔ رضا نے ہامی میں سر ہلایا اور کمرے کے اندر چلا گیا۔ اپنی شریکِ حیات کے ساتھ مہینوں گزارنے کے بعد آج پہلی دفعہ اس کو تنہائی ڈس جا رہی تھی۔

☆☆☆

گیارہواں باب

ریلوے اسٹیشن تک جانے کے لیے حامد نے ایک تانگا بک کیا۔ اگلے دن حامد اپنی اہلیہ کے ہمراہ رانی کو لے کر بٹھیا ضلع اور شہر کی سب سے مشہور ماہرِ امراضِ نسواں ڈاکٹر نیرا چودھری سے ملنے کے لیے گیا۔ رانی کی علالت کی وجہ سے تانگے کا سفر ان کے لیے قدرے مشکل تھا۔ شہر پہنچ کر وہ ڈاکٹر کے غیر سرکاری کلینک میں گئے۔ ڈاکٹر نیرا چودھری کا یہ اسپتال پورے شہر میں زچگی کے لیے مشہور تھا۔ پورے ضلع کے اندر اس کے علاوہ ایک بھی غیر سرکاری اسپتال نہیں تھا۔ موقع پر پہنچ کر انھوں نے دیکھا کہ وہاں لوگوں کا ایک سیلاب امنڈ رہا تھا۔ کچھ لوگ فرش پر لیٹے ہوئے تھے۔ کچھ زمین پر اور کچھ لوگ لکڑی کی کرسیوں پر بیٹھے ہوئے تھے۔ جگہ جگہ مریضوں اور ان کے تیمارداروں کی لمبی لمبی قطاریں لگی ہوئی تھیں۔ ''نیچے فرش پر بیٹھنے کی کیا ضرورت ہے؟ ان بخیلوں کو اسپتال میں کمرہ بک کروا لینا چاہیے تھا۔ یہ لوگ پیسے خرچ نہیں کرنا چاہتے تھے جبھی تو یہ لوگ نیچے فرش پہ سونے اور بیٹھنے پر مجبور ہیں۔ واقعی یہ لوگ کتنے کنجوس ہیں۔'' حامد کی اہلیہ نے کہا۔

''دیکھتے ہیں ہمارا کیا حال ہوتا ہے؟'' حامد نے کہا اور اپنی اہلیہ اور رانی کو پوچھ تاچھ کر کے واپس آنے تک وہیں ٹھہرے رہنے کی تلقین کر کے چلا گیا۔ دو چند منٹ کے بعد واپس آیا۔

''پہلے مجھے بیمار کا نام لکھوانے کے لیے لائن میں کھڑا رہنا ہوگا۔ پھر فیس جمع کرنے کے لیے دوسری کھڑکی کے سامنے والی لائن میں دھکے کھانے ہوں گے ۔ پھر آخری میں ڈاکٹر سے ملنے کے لیے بھی لائن میں کھڑا رہنا پڑے گا۔'' ڈاکٹر سے ملنے کا کوئی آسان راستہ نہیں ہے؟ کیا وہ سب کام کے لیے ایک ہی کھڑکی متعین نہیں کر سکتے؟'' حامد کی بیوی نے کہا۔

''نہیں ڈاکٹر سے ملنے کا یہی طریقہ ہے۔ اسپتال میں ایک کمرہ بھی بک کرانا ہوگا۔ کیونکہ مجھے نہیں لگتا کہ تمام کارروائی پوری ہونے کے بعد آج ہی گھر واپسی کے لیے ہمارے پاس وقت بچے گا اور اگر ڈاکٹر صاحبہ نے رانی کو ایڈمٹ کرنے کا مشورہ دیا تو پھر ہمیں یہیں ٹھہرنا ہوگا۔''

حامد کی بیوی نے اپنے بیگ سے ایک چادر نکالا اور شفا خانے کے باہر ایک دیوار کے سایے میں بچھا کر بیٹھ گئی۔ اس کے لیے یہ بات ناقابل یقین تھی کہ چند منٹ قبل لوگوں کے جس حال پر وہ جملے کس رہی تھی اب وہ خود وہی کرنے پر مجبور تھی۔ تمام مراحل سے گزرنے اور گھنٹوں لائن میں کھڑے رہنے کے بعد حامد کو ایک کورا کاغذ تھما دیا گیا جس میں صرف تاریخ 28/ جنوری، 1977 اور اندراج نمبر 58 نوشتہ تھا۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ ڈاکٹر نیرا چودھری ان سے قبل 57 مریضوں سے ملاقات کریں گی۔ ابھی شام کے تین بج رہے تھے۔ اور یہ لوگ صبح گیارہ بجے سے ہی اسپتال پہنچ گئے تھے۔ پھر ان کو خبر ملی کہ ڈاکٹر صاحبہ اسپتال میں موجود نہیں ہیں۔ وہ راستے میں تھیں۔ دوپہر کے کھانے بعد وہ ڈھائی بجے تک اسپتال پہنچنے والی تھیں مگر اب تک ان کی کوئی خبر نہیں ہے۔ جس کا صاف مطلب یہ ہے کہ وہ اس دن رانی کو چیک نئی کر پائیں گی۔ لہذا اب حامد کو کمرہ بک کرنا ہوگا۔ پوچھ گچھ کے بعد ان کو معلوم ہوا کہ اسپتال میں کوئی کمرہ خالی نہیں تھا۔ ڈاکٹر کے صلاح سے

قبل کمرہ بک کرنے کا کوئی اصول نہ تھا اس لیے اب ان کو خود ہی انتظام وانصرام کرنا ہوگا۔ حامد دن بھر لمبی لمبی قطاروں میں کھڑے رہنے کی وجہ سے تھک کر نڈھال ہو گیا تھا۔ اس لیے اب رہائش گاہ تلاش کرنے کی اس کے اندر سکت باقی نہیں تھی۔ حامد کی اہلیہ اپنی بہن عطیہ کے بارے میں سوچنے لگی جو وہیں کہیں قریب ہی کے علاقے میں رہتی تھی۔ ان دنوں فون کی سہولت نہیں تھی اور نہ ہی ان کو عطیہ کے گھر کا اتا پتا معلوم تھا۔ آٹھ بجے اسپتال بند ہو جائے گا لہذا اس سے پہلے ہی ان کو رہائش کا انتظام کرنا ہوگا۔ عطیہ کا بڑا بیٹا وہیں پاس سے گزر رہا تھا جو عابد کا ہم عمر تھا۔ اتفاق سے رانی نے اس کو وہاں سے گزرتے ہوئے دیکھ لیا۔ اس نے بھی رانی کو پہچان لیا اور دوڑ کر اپنی والدہ کو بتا دیا۔ عطیہ یہ سن کر کہ اس کی بڑی بہن مصیبت میں پھنسی ہوئی ہے فوراً چلی آئی اور بہن کو دیکھتے ہی دونوں ایک دوسرے سے لپٹ گئیں۔ انہوں نے وقوعِ حال پر گفتگو کی اور پھر رانی کی زچگی تک عطیہ کے گھر پر ٹھہرنے کا فیصلہ کیا۔ اگلے دن صبح تڑکے اٹھ کر حامد کلینک گیا۔ یہ شفاخانہ عطیہ کے گھر سے بہت قریب تھا۔ کلینک اگرا بھی تک کھلا نہیں تھا۔ تاہم کچھ لوگ ابھی سے ہی ڈاکٹر صاحبہ کے بارے میں استفسار کے لیے کھڑے تھے۔ پوچھ تاچھ کے بعد حامد کو پتا چلا کہ شفاخانہ ٹھیک نو بجے کھلے گا۔ واپس آ کر اس نے عطیہ کو کلینک جانے کے لیے تیار ہونے کو کہا۔ جب وہ شفاخانہ پہنچے تو وہاں اب بھی لوگوں کی لائن لگی ہوئی تھی۔ مگر اس مرتبہ مشکل سے پندرہ سے بیس لوگ ہی قطار میں تھے اس لیے حامد کو لائن میں جگہ مل گئی۔ ڈاکٹر نیرا چودھری اپنی کار سے باہر نکلی۔ ڈرائیور نے فوراً جھپٹ کر دروازہ بند کیا۔ اس وقت شہر کے صرف چنندہ اور سر برآوردہ لوگوں کے پاس ہی کار رکھنے کی صلاحیت تھی۔ ڈاکٹر صاحبہ کے آتے اسپتال کے سارے لوگ چُست ہو گئے۔ کیا باغبان کیا جاروب کش۔ دربان ہوں یا نرس یا کمپاؤنڈر ڈاکٹر صاحبہ کو دیکھتے ہی سب حرکت میں آ گئے۔ خالی بیٹھے رہنے کی حالت میں

ڈاکٹر صاحبہ کی نگاہ ان پر نہیں پڑنی چاہیے۔

''گزشتہ سات مہینے سے کہاں غائب تھے'' ڈاکٹر صاحبہ نے کسی کو ڈانٹا کسی نے ''میڈم........میڈم'' کہہ کر فریاد کی۔

''میرا وقت برباد مت کرو۔ دفع ہو جاؤ یہاں سے'' اس نے دوبارہ ڈانٹا۔

''تم نے اس عورت کو کیا سمجھ کر 'اینٹی بائٹک' اور ہین کلر دیا؟''

''ڈاکٹر صاحبہ! معافی دے دیجیے...........

دراصل وہ درد سے تڑپ رہی تھی اس لیے میں نے اس کو 'اینٹی بائٹک' دیدی۔

''کیا تم ڈاکٹر ہو؟ ہو؟ نہیں نا؟ تم پھر تم نے کیوں اپنی مرضی سے اس کو دوائی دی؟ کیوں؟'' حامد اتنا ہی سن سکا۔ اس کے بعد کمپاؤنڈر نے باہر آ کر کراری آواز میں چلایا ''نیکسٹ!''

حامد رانی کو اپنے ساتھ اندر لے گیا۔ چند منٹ قبل کمرے کے اندر سے آنے والی ڈانٹ ڈپٹ کی آواز سن کر حامد تھوڑا سہما ہوا تھا۔ ڈرے ڈرے وہ اندر داخل ہوا۔ اندر ایک غیر معمولی حسین وجمیل لیڈی ڈاکٹر صاحبہ بیٹھی ہوئی تھیں۔ اسے دیکھ کر حامد بہت مرعوب ہو گیا۔ اس کے سامنے ایسا لگا کہ اس کی قوتِ گویائی ختم ہو گئی ہے۔ اس نے بے آستین کا سوٹ زیب تن کر رکھا تھا۔ پست گیسو اور بلا آستین کا سوٹ پہننا بیتھیا ضلع میں عورتوں کے تعلق سے ابھی تک یہ رجحان مروج نہیں ہوا تھا۔ حقیقت تو یہ ہے کہ اس زمانے میں ہندوستان میں بھی یہ طرز وروش عام نہیں تھی۔ ''کہیں! کیا تکلیف ہے؟'' ڈاکٹر صاحبہ نے پوچھا۔

''سر..........سوری..........میڈم ....'' حامد نے بولنے کی کوشش کی مگر ڈاکٹر نے درمیان میں ہی اس کو ڈانٹ دیا'' میں نے آپ سے تو پوچھا نہیں۔ میں

تو پیشنٹ سے پوچھ رہی ہوں۔'' اس سے پہلے کہ رانی جواب میں کچھ بولتی ڈاکٹر نے گفتگو جاری رکھا'' لگتا ہے آپ کی پتری گربھ وتی ہے۔'' ''آٹھواں مہینہ چل رہا ہے'' حامد نے اتنا کہا اور پھر اس احساس میں کہ اس نے بغیر اجازت ہی کہہ ڈالا ہے اپنی ہتھیلیوں سے اپنا منھ چھپانے لگا۔ وہ گھبرایا ہوا تھا۔ ڈاکٹر صاحبہ نے اس کی طرف دیکھ کر مسکرا دیا۔

''بدھائی ہو! وہ آپ کی پتری ہے کیا؟''

''ہاں میڈم'' حامد نے جواب دیا

''آپ بہت خوش نصیب ربھاگیہ شالی ہیں۔ ان کے پتی مہاراج کہاں ہیں؟''

''مصروفیت کی وجہ سے وہ نہیں آسکے''

''کیا وہ بھی ڈاکٹر ہیں؟''

''نہیں میڈم۔۔۔۔۔۔''

''تو پھر ان کے مصروف ہونے کا کیا مطلب؟ بہرحال ایک پولیو ماری ہوئی لڑکی گربھ وتی نہیں ہوتی ہے۔ یہ بہت بھاگیہ شالی ہے۔''

جائیے یہ اکسرے کرا کر لائیے۔ پھر شام تک خون جانچ کی رپورٹ بھی چاہیے۔ اس کے بعد ہی میں آپ کو کچھ صحیح غلط بتا سکتی ہوں۔ کچھ پیچیدگی معلوم ہوتی ہے۔ مگر تمام رپورٹ آجانے کے بعد ہی میں کسی نتیجے تک پہنچ سکتی ہوں۔ ابھی فی الحال آپ یہ دوائیں لے لیں۔'' لائیے اس کی نبض چیک کرلوں۔''

''ہائے بھگوان! اس کو تو زور کا بخار چڑھا ہوا ہے۔ اس کو فوراً اڈمٹ کر دو'' اس نے کمپاؤنڈر کو بلا کر حکم دیا اور اگلے مریض کو اندر بھیجنے کو کہا۔

حامد کو ڈاکٹر کے چیمبر کی ایک ہدایت بھی پلے نہیں پڑی۔

کمپاؤنڈر نے اس کی ساری گتھیاں سلجھا دیں۔

اور پھر اس کو ایک مخصوص ایکسرے سینٹر جانے کی تلقین کی جو وہاں سے تقریباً پانچ کلومیٹر کی مسافت پر تھا۔ اگرچہ وہاں قریب میں درجنوں ایکسرے سینٹر تھے۔ کمپاؤنڈر ایسا اس لیے کرتا تھا کیوں کہ وہ ایکسرے سینٹر اس کے دوست کا تھا۔اور ایسا کرنے سے اس کو دس فیصد دلالی کا ملتا تھا۔ کمپاؤنڈر کے مشورہ کی خلاف ورزی کرنے کی کسی کے اندر جرأت نہیں تھی۔اور اگر کوئی ایسا کرتا تو کمپاؤنڈر ذرہ برابر بھی اس کی مدد نہیں کرتا۔

ڈاکٹر کے مشورہ کے مطابق حامد نے رانی کو داخلِ اسپتال کرادیا تاکہ ڈاکٹر وقتاً فوقتاً اس کی دیکھ بھال کر سکے۔

اگلے دن حامد رپورٹ کے تمام کاغذات لے کر ڈاکٹر کے پاس گیا۔ بڑی مشکل سے لائن میں دھکم مکی کر کے وہ ڈاکٹر صاحبہ تک پہنچا۔

رپورٹ پر نظر پڑتے ہی ڈاکٹر صاحبہ کی پیشانی پر سلوٹیں چھا گئیں۔

''آخر وہی ہوا جس کا مجھے ڈر تھا۔ یہ بیماری کا بہت پیچیدہ پہلو ہے۔''

''ہوا کیا ہے میڈم؟''

''آپ نہیں سمجھو گے حامد صاحب۔ بس آپ اتنا کیجیے کہ کسی طرح اس کے پتی کو یہاں بلا لیجیے۔

سرجری کرنے کی ضرورت پڑ سکتی ہے۔''

سرجری؟ یہ کیا ہوتی ہے؟''

''پیٹ کاٹ کر کے بچہ باہر نکالنے کی تکنیک کو سرجری کہا جاتا ہے۔ یہی ایک طریقہ ہے۔تاہم بچے کی لائف کی گارنٹی نہیں لے سکتی۔

سرجری کے لیے گارجین کا دستخط لینا ضروری ہوتا ہے۔

اس کاغذ پر لکھا ہوتا ہے کہ آپریشن کے سلسلے میں گارجین کو کوئی آبجکشن نہیں ہے۔

کیونکہ اس پروسیس میں پیشنٹ کی زندگی اور موت کا کوئی بھروسہ نہیں ہوتا۔ساتھ ہی ساتھ یہ بہت مہنگا بھی ہوتا ہے۔بہر حال۔گھبرانے کی ضرورت نہیں ہے۔آپ کے پاس فیصلہ لینے کے لیے ابھی وقت ہے۔اگلے دو دن میں فیصلہ کر کے بتائیں۔

مگر ایک ہفتہ سے زیادہ لیٹ کرنا خطرے کا کارن ہو سکتا ہے۔''

حامد نے بڑی سنجیدگی سے ڈاکٹر صاحبہ کی باتیں سنیں۔

پھر وہ کلینک سے باہر آیا جہاں رانی کی ماں اور عطیہ اس کے انتظار میں اچھے بُرے کی خبر سننے کے لیے بیتاب تھیں۔

''کیا کہا؟'' عطیہ نے سوال کیا۔

''ڈاکٹر صاحبہ نے کیا کہا؟'' رانی کی امی نے دریافت کیا۔

حامد چپ چپ ان کے سامنے تصویرِ حیرت بنا کھڑا رہا۔ وہ ان سے حقیقت چھپانے کی کوشش کر رہا تھا مگر اس کی ذبڈبائی ہوئی سرخ آنکھوں نے معاملے کی نزاکت کا اظہار کر دیا۔ آنسو پونچھتے ہوئے اس نے کہا: ''سب کچھ ٹھیک ہے۔ بس کسی طرح رضا کو یہاں بلانا ہوگا۔ڈاکٹر صاحبہ کھوج رہی تھیں۔''

رانی کی ماں آسانی سے سمجھ گئی کہ کچھ نہ کچھ ہے جس کو حامد چھپانے کی کوشش کر رہا ہے۔

عطیہ بولی ''میں پوسٹ آفس جا کر رضا کو ٹیلی گرام کر دیتی ہوں کہ یہاں اس کی ضرورت ہے۔'' یہ کہہ کر وہ پوسٹ آفس کے لیے روانہ ہوگئی۔

حامد کو تنہا پا کر رانی کی والدہ نے ایک بار پھر واقعۂ حال دریافت کرنے کی کوشش کی، ''کیا پریشانی درپیش ہے رانی کو؟ سب خیر ہے یا نہیں؟'' حامد کو معلوم تھا کہ وہ اپنی اہلیہ سے کوئی چیز چھپا نہیں سکتا۔وہ آسانی سے اس کا جھوٹ پکڑ لیتی ہے۔

وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا اور بھیگی بھیگی آواز میں کہنے لگا کہ رانی کے بچے کی پیدائش خطرے میں ہے۔ زچگی کا عمل سرجری کے بغیر ممکن ہی نہیں ہے۔

زچگی کی حالت میں سرجری ان دنوں شاذونادر ہی ہوتی تھی۔ اس زمانے میں زیادہ تر زچگی گھر ہی میں کسی بوڑھی تجربہ کار دائی جنائی کی نگرانی میں ہوا کرتی تھی۔ مشکل سے دو فیصد ہی ڈلیوری اسپتالوں میں ہوتی ہونگی۔ یہی وجہ تھی کہ جب حامد کے عزیز و اقارب کو یہ خبر ملی تو ان کا ردعمل ایسا تھا کہ جیسے رانی اب اپنی زندگی کی آخری سانسیں لے رہی ہے۔ ان میں سے اکثر نے تو اپنی پوری زندگی میں سرجری کا نام تک نہیں سنا تھا۔ یہ جانکاہ خبر سنتے ہی عطیہ کا گھر ماتم کدہ بن گیا۔

''بچے کو بچانے کا کوئی اپائے نہیں ہے''۔ رانی کی ماں یہ کہہ کر رونے لگی۔

''بچے کی زندگی وفا کرے یا نہ کرے کوئی بات نہیں مگر یا خدا میری بیٹی کو سلامت رکھیو'' حامد اداس اور ملول ہو گیا اور اس کی آنکھوں میں تھما ہوا آنسوؤں کا سمندر ریکا یک بہہ نکلا۔ حامد ہو کہ اس کی بیوی عطیہ ہو یا دوسرے خویش و اقارب سبھوں کے دل میں غموں کا طوفان مچل رہا تھا اور سب کی آنکھیں برس رہی تھیں۔ مگر اسی وقت وہ لوگ رانی سے اپنے جذبات چھپانے کی کوشش کر رہے تھے۔ رانی بیچاری حقیقت سے بے خبر تھی۔

رانی سرجری کے نام سے قدرے گھبرائی ہوئی تھی لیکن پھر بھی وہ یہ سوچ کر خوش تھی کہ اس کے بچہ تولد ہونے والا تھا۔ ''میرے دل کے ٹکڑے کی شکل و صورت کیسی ہوگی؟ وہ کس پر جائے گا۔ اپنے باپ پر یا مجھ پر؟ اگر بیٹا ہوا تو بہتر ہوگا کہ اپنے والد کی شکل و شباہت کا ہو۔ اور اگر بیٹی ہوئی تو میری شکل و شمائل کی ہونی چاہیے۔'' رانی اپنے ہونے والے بچے کے خیالوں مین ڈوبی ہوئی تھی۔

''اماں! رضا اب تک نہیں آئے؟'' رانی نے اپنی والدہ سے دریافت کیا۔

''وہ اپنے کاروبار میں مصروف ہوگا۔'' رانی کی امی اس کے سر پر شفقت سے ہاتھ پھیرتے ہوئے بولی۔

''اماں، منّے کے لیے کچھ کپڑے اور کھلونے خرید لیجیے کیوں کہ ولادت کے بعد فوراً اسی کی ضرورت پڑے گی۔'' رانی نے اپنی امنگوں کا اظہار کیا۔

''ہوں.........ضرور'' اس کی لمّاں اس سے اپنے آنسو چھپانا چاہتی تھی اس لیے اس نے اپنے آنچل سے اپنا چہرہ ڈھک لیا۔مگر وہ اپنی بھرائی ہوئی آواز نہ چھپا سکی۔

''آپ رو کیوں رہی ہیں؟ اماں!''

''نانی بننے کی خوشی میں میرا کلیجہ اچھل رہا ہے اس لیے خوشی کے آنسو خود بخود بہہ نکلے'' یہ کہہ کر وہ فوراً کمرے سے باہر چلی گئی۔ایک گوشے میں دیوار کی طرف منہ کر کے پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔عطیہ اس کے رونے کی آواز سن کر وہاں آئی اور اس کو دلاسہ دینے لگی۔

''اللہ بہت عظیم ہے۔ وہ سب کے ساتھ انصاف کرتا ہے۔تمہارے ساتھ بھی انصاف ہی کرے گا۔حامد بھائی ڈاکٹر سے ملنے گئے ہیں۔دیکھیے وہ کوئی نہ کوئی حل لے کر ہی آئیں گے۔سب کچھ اللہ ہی کے اختیار میں ہے۔آیئے چل کر دعا کرتے ہیں۔کس کو خبر ہے کہ قدرت کا کرشمہ اپنا جلوہ دکھادے اور اللہ کی رحمت آپ کی بیٹی اور اس کے بچے دونوں کی جانیں بخش دے! اللہ کی قدرت سے کچھ بعید نہیں۔''

ٹیلی گرام ملتے ہی رضا دکان بند کر کے گھر چلا گیا۔وہ بتھیا جانے کے لیے تیار تھا۔ مجیب اس کو گھر آتے دیکھ کر اپنے کمرے میں گیا اور اس سلسلے میں اپنی جورو شینخو سے بات کرنے لگا۔شینخو آگاہ تھی کہ اگر رضا بتھیا جاتا ہے تو وہ ضرور کچھ نہ کچھ پیسے بھی اپنے ساتھ لے جائے گا اور اگر سرجری کی نوبت آئی پھر تو وہ ایک بڑی رقم خرچ کرے گا جو اس کی اپنی

نہیں بلکہ پوری فیملی کی ملکیت ہے۔ اس لیے اس کو اپنے شاطرانہ دماغ کا استعمال کر کے اپنے خاوند کو منانا ہوگا کہ وہ کسی بھی ترکیب سے رضا کو بتھیا جانے سے روکے۔ جب مجیب اپنے روم سے نکلا تو اس نے رضا کو ڈاکٹر صاحب کے ساتھ محوِ گفتگو دیکھا۔ اس کو خوف ہوا کہ کہیں رضا ڈاکٹر صاحب کو راضی نہ کر لے اور وہ پھر رضا کو جانے کی اجازت دے دیں گے اس لیے وہ ایک جھپٹے میں ان تک پہنچ گیا۔

''کیا بات ہوئی ہے؟'' اس نے پوچھا۔

''اس کو ٹیلی گرام ملا ہے کہ رانی کی سرجری ہونے والی ہے اور وہ زندگی اور موت کے درمیان ہے۔ اس لیے یہ بتھیا جانا چاہتا ہے۔'' ڈاکٹر صاحب نے کہا۔ ''میرے خیال سے اس کو ضرور جانا چاہیے کیونکہ اس کی بیوی اور بچے کی جان خطرے میں ہے۔ مسئلہ یہ ہے کہ میں نہیں چاہتا کہ وہ بغیر کچھ روپے پیسے کے وہاں جائے۔ کیونکہ اسپتال کے بل بھرنے کی ذمہ اس کی ہے۔'' ڈاکٹر صاحب نے مزید کہا۔

''اسکول کی منظوری کے سلسلے میں آج مجھے فوری طور پر پٹنہ جانا ہوگا۔ حکومت سے منظوری اور الحاق کی آج آخری اور فائنل میٹنگ ہے۔ الحاق کے بعد ہم تینوں بھائی ایک ہی اسکول کے ٹیچر اور سرکاری ملازم ہو جائیں گے۔ اس لیے میرے خیال سے مجھے پٹنہ جانا چاہیے اور رضا کو چاہیے کہ اگلے دو تین دن تک وہ یہیں دکان کا کاروبار سنبھالے۔ اس کے بعد وہ جہاں جانا چاہے چلا جائے۔

مجیب نے مشورہ دیا۔

''نہیں۔ ہرگز نہیں۔ اس وقت رانی اور اس کی بچی کی زندگی سے زیادہ اہم کچھ بھی نہیں ہے۔'' ڈاکٹر صاحب نے اس کے مشورہ کو بالکل مسترد کر دیا۔ مجیب نے اس جنگ میں خود کو شکست خوردہ محسوس کیا۔ ڈاکٹر صاحب رضا کے لیے پیسے لانے اپنے کمرے کے

اندر گئے۔ مجیب نے موقعے کو غنیمت جانا۔ رضا کے قریب آیا اور اس کو بہکانے کی کوشش کی۔

''تمہیں کچھ گمان بھی ہے کہ سرجری میں کتنے پیسے لگتے ہیں؟ اس میں بہت پیسے خرچ ہوتے ہیں۔ اگر تم بتھیا جاؤ گے تو خرچ کی ذمہ داری تمہارے سر ہوگی اور اگر نہیں جاؤ گے تو اس کے ساتھ خود اس کے ماں باپ تو ہیں ہی۔ وہ اس نازک گھڑی اس کو تھوڑی چھوڑ کے بھاگنے والے ہیں۔ اگر آج میں پٹنہ نہیں گیا تو سوچو کتنا بڑا خسارہ ہوگا؟ اگر حکومت نے اسکول کو منظوری کا پروانہ دے دیا تو ہم سب ٹیچر ہو جائیں گے۔ ہر مہینے تنخواہ ملے گی۔۔ اگر تم نہیں گئے تو پھر کچھ نقصان نہیں ہونے والا۔ اس کے والدین اس کی زندگی بچانے کی ہر ممکن کوشش کریں گے۔ اب فیصلہ تمہارے ہاتھ میں ہے۔'' مجیب نے اس کو دھوکہ دینے کی کوشش کی۔ ڈاکٹر صاحب کمرے سے پیسے لے کر باہر آئے۔ جب ڈاکٹر صاحب باہر آئے مجیب چلا گیا مگر تب تک اس نے اپنا کام کر دیا تھا۔ اب رضا شش و پنج میں پڑ گیا۔ اسپتال میں رانی اور اس کے تمام رشتے دار اس کی آس لگائے بیٹھے تھے۔ ایک نرس ایک فائل لے کر باہر آئی اور زور سے چلائی ''رانی کا گارجین کون ہے؟''

''میں ہوں۔'' مجمع سے حامد کی آواز آئی۔

''نہیں۔ میرا مطلب ہے اس کے پتی کہاں ہیں؟'' نرس نے پوچھا۔

''وہ اپنے کاروبار میں مصروف ہے۔ لیکن کوئی بات نہیں۔ یہاں میں ہی اس کا گارجین ہوں۔ میں اس کا ابا ہوں۔ کیا کرنا ہے آپ مجھ سے کہہ سکتی ہیں۔'' حامد نے وضاحت سے کہا۔

''کیا؟ اس کے پتی کو فرصت نہیں ہے؟ اس کی پتنی اور اس کا شِشو یہاں جیِوَن مَرَن کے بیچ ہے اور وہ اپنے جاب میں بِزِی ہے؟

نہیں بلکہ پوری فیملی کی ملکیت ہے۔ اس لیے اس کو اپنے شاطرانہ دماغ کا استعمال کر کے اپنے خاوند کو منانا ہوگا کہ وہ کسی بھی ترکیب سے رضا کو بتھیا جانے سے روکے۔ جب مجیب اپنے روم سے نکلا تو اس نے رضا کو ڈاکٹر صاحب کے ساتھ محوِ گفتگو دیکھا۔ اس کو خوف ہوا کہ کہیں رضا ڈاکٹر صاحب کو راضی نہ کرلے اور وہ پھر رضا کو جانے کی اجازت دے دیں گے اس لیے وہ ایک جھپٹے میں ان تک پہنچ گیا۔

''کیا بات ہوئی ہے؟'' اس نے پوچھا۔

''اس کو ٹیلی گرام ملا ہے کہ رانی کی سرجری ہونے والی ہے اور وہ زندگی اور موت کے درمیان ہے۔ اس لیے یہ بتھیا جانا چاہتا ہے۔'' ڈاکٹر صاحب نے کہا۔ ''میرے خیال سے اس کو ضرور جانا چاہیے کیونکہ اس کی بیوی اور بچے کی جان خطرے میں ہے۔ مسئلہ یہ ہے کہ میں نہیں چاہتا کہ وہ بغیر کچھ روپے پیسے کے وہاں جائے۔ کیونکہ اسپتال کے بل بھرنے کی ذمہ اس کی ہے۔'' ڈاکٹر صاحب نے مزید کہا۔

''اسکول کی منظوری کے سلسلے میں آج مجھے فوری طور پر پٹنہ جانا ہوگا۔ حکومت سے منظوری اور الحاق کی آج آخری اور فائنل میٹنگ ہے۔ الحاق کے بعد ہم تینوں بھائی ایک ہی اسکول کے ٹیچر اور سرکاری ملازم ہو جائیں گے۔ اس لیے میرے خیال سے مجھے پٹنہ جانا چاہیے اور رضا کو چاہیے کہ اگلے دو تین دن تک وہ یہیں دکان کا کاروبار سنبھالے۔ اس کے بعد وہ جہاں جانا چاہے چلا جائے۔

مجیب نے مشورہ دیا۔

''نہیں۔ ہرگز نہیں۔ اس وقت رانی اور اس کی بچی کی زندگی سے زیادہ اہم کچھ بھی نہیں ہے۔'' ڈاکٹر صاحب نے اس کے مشورہ کو بالکل مسترد کر دیا۔ مجیب نے اس جنگ میں خود کو شکست خوردہ محسوس کیا۔ ڈاکٹر صاحب رضا کے لیے پیسے لانے اپنے کمرے کے

اندر گئے۔ مجیب نے موقعے کو غنیمت جانا۔ رضا کے قریب آیا اور اس کو بہکانے کی کوشش کی۔

''تمہیں کچھ گمان بھی ہے کہ سرجری میں کتنے پیسے لگتے ہیں؟ اس میں بہت پیسے خرچ ہوتے ہیں۔ اگر تم بتھیا جاؤ گے تو خرچ کی ذمہ داری تمہارے سر ہو گی اور اگر نہیں جاؤ گے تو اس کے ساتھ خود اس کے ماں باپ تو ہیں ہی۔ وہ اس نازک گھڑی اس کو تھوڑی چھوڑ کے بھاگنے والے ہیں۔ اگر آج میں پٹنہ نہیں گیا تو سوچو کتنا بڑا خسارہ ہو گا؟ اگر حکومت نے اسکول کو منظوری کا پروانہ دے دیا تو ہم سب ٹیچر ہو جائیں گے۔ ہر مہینے تنخواہ ملے گی۔۔ اگر تم نہیں گئے تو پھر کچھ نقصان نہیں ہونے والا۔ اس کے والدین اس کی زندگی بچانے کی ہر ممکن کوشش کریں گے۔ اب فیصلہ تمہارے ہاتھ میں ہے۔'' مجیب نے اس کو دھوکہ دینے کی کوشش کی۔ ڈاکٹر صاحب کمرے سے پیسے لے کر باہر آئے۔ جب ڈاکٹر صاحب باہر آئے مجیب چلا گیا مگر تب تک اس نے اپنا کام کر دیا تھا۔ اب رضا شش و پنج میں پڑ گیا۔ اسپتال میں رانی اور اس کے تمام رشتے دار اس کی آس لگائے بیٹھے تھے۔

ایک نرس ایک فائل لے کر باہر آئی اور زور سے چلائی ''رانی کا گارجین کون ہے؟''

''میں ہوں۔'' مجمع سے حامد کی آواز آئی۔

''نہیں۔ میرا مطلب ہے اس کے پتی کہاں ہیں؟'' نرس نے پوچھا۔

''وہ اپنے کاروبار میں مصروف ہے۔ لیکن کوئی بات نہیں۔ یہاں میں ہی اس کا گارجین ہوں۔ میں اس کا ابا ہوں۔ کیا کرنا ہے آپ مجھ سے کہہ سکتی ہیں۔'' حامد نے وضاحت سے کہا۔

''کیا؟ اس کے پتی کو فرصت نہیں ہے؟ اس کی پتنی اور اس کا شِشُو یہاں جِیوَن مَرَن کے بیچ ہے اور وہ اپنے جاب میں بِزی ہے؟

اندر گئے۔ مجیب نے موقع کو غنیمت جانا۔ رضا کے قریب آیا اور اس کو بہکانے کی کوشش کی۔

''تمہیں کچھ گمان بھی ہے کہ سرجری میں کتنے پیسے لگتے ہیں؟ اس میں بہت پیسے خرچ ہوتے ہیں۔ اگر تم بتھیا جاؤ گے تو خرچ کی ذمہ داری تمہارے سر ہوگی اور اگر نہیں جاؤ گے تو اس کے ساتھ خود اس کے ماں باپ تو ہیں ہی۔ وہ اس نازک گھڑی اس کو تھوڑی چھوڑ کے بھاگنے والے ہیں۔ اگر آج میں پٹنہ نہیں گیا تو سوچو کتنا بڑا خسارہ ہوگا؟ اگر حکومت نے اسکول کو منظوری کا پروانہ دے دیا تو ہم سب ٹیچر ہو جائیں گے۔ ہر مہینے تنخواہ ملے گی۔۔ اگر تم نہیں گئے تو پھر کچھ نقصان نہیں ہونے والا۔ اس کے والدین اس کی زندگی بچانے کی ہر ممکن کوشش کریں گے۔ اب فیصلہ تمہارے ہاتھ میں ہے۔'' مجیب نے اس کو دھوکہ دینے کی کوشش کی۔ ڈاکٹر صاحب کمرے سے پیسے لے کر باہر آئے۔ جب ڈاکٹر صاحب باہر آئے مجیب چلا گیا مگر تب تک اس نے اپنا کام کر دیا تھا۔ اب رضا شش وپنج میں پڑ گیا۔ اسپتال میں رانی اور اس کے تمام رشتے دار اس کی آس لگائے بیٹھے تھے۔

ایک نرس ایک فائل لے کر باہر آئی اور زور سے چلائی ''رانی کا گارجین کون ہے؟''

''میں ہوں۔'' مجمع سے حامد کی آواز آئی۔

''نہیں۔ میرا مطلب ہے اس کے پتی کہاں ہیں؟'' نرس نے پوچھا۔

''وہ اپنے کاروبار میں مصروف ہے۔ لیکن کوئی بات نہیں۔ یہاں میں ہی اس کا گارجین ہوں۔ میں اس کا ابا ہوں۔ کیا کرنا ہے آپ مجھ سے کہہ سکتی ہیں۔'' حامد نے وضاحت سے کہا۔

''کیا؟ اس کے پتی کو فرصت نہیں ہے؟ اس کی پتنی اور اس کا شِشو یہاں جیون مَرن کے بیچ ہے اور وہ اپنے جاب میں بزی ہے؟

واہ کیا بات ہے!''۔نرس طنز کرتے ہوئے بولی۔

''اس کی پتنی وِک لانگ ہے اس لیے وہ اس کو چھوڑنے کی پلاننگ کر رہا ہے۔ کیا اس مورکھ کو یہ پتہ نہیں کہ اس کی پتنی اور اس کا شیشو خطرے میں ہے؟ جاب میں بزی ہے.......ہونہہ....''

وہ فائل لے کر حامد کے پاس آئی اور دو چند جگہوں پر اس سے دستخط کرا کر چلی گئی۔ پھر رانی کو آپریشن تھیٹر میں لایا گیا۔عطیہ، اس کے بیٹے، رانی کی امی اور حامد کے کچھ پڑوسی سب وہاں موجود تھے۔ ڈاکٹر صاحبہ نے حامد کو اپنے پاس بلایا اور اس کی پشت پر اپنا ہاتھ تھپتھپاتے ہوئے بولی۔''میں ماں اور شِشو دونوں کا جیون بچانے کی بھرپور کوشش کروں گی۔باقی سب بھگوان کے ہاتھ میں ہے۔''

حامد جواب میں کچھ نہ کہہ سکا۔وہ بس اس کے سامنے ہاتھ جوڑ کر کھڑا رہا کیوں کہ اب ڈاکٹر ہی ڈوبتے کو تنکے کا سہارا تھی۔

لوگ اسپتال کے باہر تھے اور آپریشن پایۂ تکمیل کو پہنچ گیا۔حامد اور اس کی اہلیہ کو اپنی زندگی میں پہلی دفعہ سرجری کے بارے میں کچھ سننے اور جاننے کا موقع ملا تھا۔وہ بھی کسی غیر کی نہیں بلکہ خود اپنی بیٹی کی سرجری ہو رہی تھی۔رانی کی والدہ بے ہوش ہو کر گر پڑی۔اسپتال کے لوگ اس کے گرد جمع ہو گئے۔ان میں سے کسی نے اس کے چہرے پر پانی کا چھڑکاؤ کیا۔اور وہ ہوش میں آ گئی۔اسپتال میں ہر کوئی پرنم آنکھوں سے خدا تعالیٰ کی بارگاہ میں رانی کی زندگی کی بھیک مانگ رہا تھا۔آدھے گھنٹے کے بعد ایک نرس باہر آئی اور کچھ ضروری ساز و سامان لے کر دوڑی ہوئی آپریشن تھیٹر کے اندر چلی گئی۔لیکن اس کے اندر داخل ہونے سے قبل عطیہ نے رانی کی حالت دریافت کی۔

''حالت بہت نازک ہے۔لیکن ہم لوگ پوری کوشش کر رہے ہیں'' اتنا کہہ کر وہ

اندر چلی گئی۔ رانی کے والدین اس کی زندگی کی دعائیں کر رہے تھے۔ ایک گھنٹہ کے بعد ان کے کانوں میں بچے کے رونے کی آواز گونجی۔

ڈاکٹر صاحبہ باہر آئیں۔

''بدھائی ہو مسٹر حامد! آپ نانا بن گئے۔ لیکن آپ کی بٹیا کی اَستھتی بہت سنکٹ آتمک ہے۔ اس کا بلڈ پریشر بہت سست ہے۔'' اتنا کہہ کر وہ اندر چلی گئی۔

وہ لوگ بچے کی پیدائش کا جشن مناتے بھی تو کیسے مناتے جبکہ رانی زندگی اور موت کے درمیان لٹکی ہوئی تھی۔ ولادت کی خوشخبری سن کر حامد اور اس کی بیوی ابھی اطمینان کی گہری ٹھنڈی سانس لینے بھی نہ پائے تھے کہ ایک نرس اچانک ہانپتی ہوئی آئی اور کمپاؤنڈر کو خبر دی کہ ابھی آپریشن نامکمل ہے اور بچہ بھی نہ رو رہا ہے نہ بلک رہا ہے۔ ایک بوڑھی تجربہ کار عورت آئی جو نرسوں کی ہیڈ تھی اس نے مشورہ دیا کہ اس حال کی اطلاع فوراً ڈاکٹر صاحبہ کو دینی چاہیے۔ ڈاکٹر صاحبہ بھی اس معاملے میں بڑی سنجیدگی کا مظاہرہ کر رہی تھیں۔ باہر آ کر بچے کی جانچ پڑتال کے بعد وہ گویا ہوئیں۔

''بچے کو علی الفور آکسیجن کی ضرورت ہے!'' اس وقت نہ تو اس شہر میں آکسیجن کی سہولت تھی اور نہ تو آس پاس کے شہروں میں۔ ڈاکٹر صاحبہ بچے کو کسی اور شہر میں بھیج کر خطرہ مول لینا نہیں چاہتی تھیں۔ اس لیے اس نے بچے کو اپنی خاص نگرانی میں رکھنے کا فیصلہ لیا۔ اس نے حامد سے کہا کہ بچے کی جان خطرے میں ہے۔ اگر اگلے چوبیس گھنٹے تک اس کی دھڑکن حرکت میں رہی تو وہ زندہ بچ سکے گا ورنہ وہ صرف چند گھنٹوں کا مہمان ہے۔ وہ چوبیس گھنٹے ان کے لیے چوبیس برس کی مدتِ مدید کے مانند دراز ہو گئے۔ رضا ان تمام احوال وکوائف سے بے خبر اپنی روزمرہ کی زندگی میں مشغول تھا۔ صبح چھ بجے دکان جانا اور شام نو بجے واپس گھر لوٹ آنا اس کی زندگی کا معمول تھا۔ مگر دل ہی دل میں وہ رانی کے بارے

میں بےحد فکر مند تھا۔ وہ تو اس بات سے بھی بیگانہ تھا کہ اس کا بچہ اب تک متولد ہوا ہے یا نہیں۔ اس کو کیا خبر تھی کہ اس کے بغیر رانی اور اس کے والدین کو کیسی کیسی مشکلات سے دوچار ہونا پڑ رہا ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے اس کو بار بار ابھارا تا کہ وہ اسپتال جا کر اپنی بیوی بچے کا حال دریافت کرے مگر اس پر تو مجیب کا جادو چل چکا تھا۔ وہ یہ سوچ کر بیٹھ گیا تھا کہ وہاں تو رانی کی دیکھ بھال کے لیے اس کے والدین کافی ہیں۔ اگلی صبح جب اسپتال میں نومولود بچے کی زندگی کو سوچ کر ہر کسی پر سکتے کی کیفیت طاری تھی ڈاکٹر صاحب نے رضا کو بلا کر زبردستی اسپتال جانے کی تاکید کی۔ اس بار رضا اسپتال جانے کے لیے تیار ہو گیا۔ اڑوس پڑوس کے محلے کے چند وکیل روزانہ بتھیا کورٹ جایا کرتے تھے۔ عطیہ نے ان میں سے ایک وکیل کے ہاتھوں مجیب کو پیغام بھجوایا کہ رضا کی بیوی کے ایک بھولا بھالا چاند کا ٹکڑا تولد ہوا ہے۔ اسپتال میں درپیش مسائل کی وجہ سے وہ مزید تفصیلات بھیجنے سے قاصر رہی۔ مجیب نے یہ خوش خبری پوری فیملی کو سنائی۔ رضا یہ خوش خبری سن کر جذبات کے سمندر میں بہہ گیا۔ اس کے چہرے پر خوشی کی ہزاروں کلیاں کھل اٹھیں۔ اس کو یقین نہیں ہو رہا تھا کہ وہ باپ بن چکا ہے۔ وہ یہ خوشگوار لمحہ کسی کے ساتھ مل کر بتانا چاہتا تھا۔ زندگی میں پہلی مرتبہ رضا کو حد سے زیادہ رانی کی یاد آ رہی تھی۔ اسپتال میں رانی کی اماں ساری رات اپنے لاڈلے نواسے کو گود میں لے کر بیٹھی رہی۔ جب وہ تھک جاتی تب عطیہ بچے کو اپنے آغوش میں لے لیتی۔ یہ عمل باری باری ساری رات جاری رہا۔ دونوں بہنیں رات بھر اللہ اللہ کرتی رہیں۔

صبح ڈاکٹر صاحبہ بچے کی جانچ کے لیے آئیں۔ بچے کی نبض شناسی سے فارغ ہو کر وہ حامد، اس کی اہلیہ اور عطیہ سے یوں مخاطب ہوئیں ''میرے پاس آپ سب کے لیے ایک اچھی خبر ہے اور ایک بری خبر ہے۔ گڈ نیوز یہ ہے کہ بچہ اب خطرے کی گھنٹی سے باہر ہے

اور بیڈ نیوز یہ ہے کہ رانی اب دوبارہ ماں نہیں بن سکتی۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ یہ بچہ رانی کا اکلوتا راج کمار ہے۔ اس بچے کو جیوّن بھر سخت گرمی اور سردی سے دور رہنا ہوگا۔ بہت زیادہ تاپ مان یا بہت کم تاپ مان دونوں ہی اس کے لیے خطرہ بن سکتے ہیں۔ اس کو پوری زندگی گرمی اور سردی میں چوکنا رہنے کی ضرورت ہے۔''

مخاطبین کے جذبات کا خیال کیے بغیر ہی ڈاکٹر نیرا چودھری ایک ہی سانس میں بولتی چلی گئی۔

''اللہ کے ہر فعل میں ہماری بھلائی پوشیدہ ہے۔'' عطیہ نے یہ کہہ کر رانی کی اماں کو تسلی دینے کی کوشش کی۔ ''آپ کو رب کا شکر ادا کرنا چاہیے کہ آپکی بیٹی اور نواسہ دونوں صحیح وسالم ہیں'' عطیہ نے اضافہ کیا۔

ایک نرس آئی اور حامد کو اپنے ساتھ آفس میں لے گئی۔ اس نے حامد کے سامنے ایک فائل وا کیا اور دو چند جگہوں پر دستخط طلب کی۔

''اب یہ کاغذات کس لیے ہیں؟'' حامد نے دریافت کیا۔

''یہ ڈس چارج فائل ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اب آپ پیشنٹ کو اپنے ساتھ گھر لے جا سکتے ہیں۔'' نرس حامد کے لیے وضاحت کرتے ہوئے بولی۔

حامد کے دل میں خوشی کا طوفان مچل رہا تھا۔ وہ فوراً گھر جا کر یہ خوش خبری پورے گھر محلے والوں کو سنانا چاہتا تھا۔

☆☆☆

بارہواں باب

مجیب خوشی سے ایسے جھومتا ہوا گھر آیا جیسے اس نے بہت بڑی جنگ فتح کرلی ہو۔وہ برآمدے میں اس شان سے بیٹھا ہوا تھا جیسے کوئی پہلوان بہت بڑا مقابلہ سر کرکے اپنے گھر لوٹتا ہے۔رضا بھی یہ جاننے کے لیے بیتاب تھا کہ اس کے بھائی کی پوٹلی میں خوش خبری کا کون ساگر پوشیدہ ہے۔مجیب کے چہرہ پر خوشی کی عجیب تمتماہٹ تھی۔

''حکومت نے ہمیں اقلیتی ادارے کی منظوری دیدی''مجیب خوشی سے بول پڑا۔

''واہ! یہ تو بہت بڑی خوش خبری ہے۔اس کا مطلب اب ہم تینوں بھائیوں کے پاس سرکاری ملازمت ہے۔اب ہم تینوں ٹیچر بن جائیں گے۔واہ بھئی واہ! اس سے بہتر اور کیا ہوسکتا ہے۔؟اس سے بڑھ کر مژدۂ جانفزا ممکن ہی نہیں۔''رضا فرطِ مسرت سے تقریباً چیخ اٹھا۔وہ جذبات کے طلاطم میں بہہ گیا۔وہ یہ خوشخبری کسی خاص شخص کو جلد سے جلد سنانا چاہتا تھا جو اس کے دل کے بہت قریب تھا۔تب اس نے رضوان کو بُلا کر بتایا کہ'' ہمارے اسکول کو منظوری مل گئی۔ہم لوگ ٹیچر بن گئے۔''تینوں بھائیوں نے مل بانٹ کر اس مسرت آگیں لمحے کا جشن منایا۔رضا کی خوشیوں کی کوئی انتہا نہ رہی کیونکہ ابھی ابھی اس کو باپ بننے کی بشارت ملی ہی تھی اور پھر اس پر اس نویدِ دل آرام نے اس کی خوشی و مسرت میں دوگنا اضافہ کردیا۔وہ خوشی کے طلاطم میں بہہ گیا۔وہ بلا کسی تاخیر کے یہ خوش خبری اپنی

رفیقۂ حیات کو سنانا چاہتا تھا۔ نکاح کے بعد اس کی عادت سی بن گئی تھی کہ وہ ہر خوشی کو پہلے اپنی بیوی سے شیئر کرتا تھا۔ مگر وہ اپنا دل مسوس کے رہ گیا کیوں کہ اب تک اس علاقے میں فون وغیرہ کی سہولت نہیں تھی۔ تاہم اس نے اپنی بیوی سے ملنے کی ایک راہ نکال ہی لی۔ وہ سائیکل پر سوار ہوا اور ہوا کی رفتار سے بات کرتے ہوئے ایک گھنٹے کے اندر رانی کے یہاں پہنچ گیا۔ عابد، جس نے بہت پہلے ہی تعلیم کو الوداع کہہ دیا تھا، آجکل اپنے ابا کے ہمراہ کھیتی باڑی کے کاموں میں مشغول رہا کرتا تھا۔ وہ اپنے ابا کی معیت و معاونت میں روزانہ کھیت کا چکر لگایا کرتا تھا۔ رضا کو آتے دیکھ کر وہ یہ خبر اپنی اماں کو سنانے کے لیے دوڑا۔ مگر کچھ بچوں نے اس سے بھی زیادہ تیز رفتاری سے دوڑ کر یہ خبر رانی کو سنا دی۔ رانی خوشی سے مچل اٹھی۔ رانی کے والدین کے ذہن میں کہیں نہ کہیں شکوک وشبہات کی دھندلی سی لکیریں تھیں کہ رانی چونکہ اپاہج لڑکی ہے اس لیے کہیں ایسا نہ ہو کہ رضا اس کو چھوڑ دے۔ اس شک کا پیدا ہونا یقینی تھا کیوں کہ رانی جب امید سے تھی تو رضا کی فیملی کے کسی فرد نے اس کی خیریت تک معلوم نہیں کی۔ اسی وجہ سے رانی کے والدین رضا سے ملاقات کے لیے بیتاب تھے اور ساتھ ہی ساتھ یہ دونوں اپنی ناراضگی کا اظہار کرنے کے لیے بھی بے قرار تھے۔ جوں ہی رانی نے رضا کو برآمدے سے داخل ہوتے دیکھا وہ اپنے شیر خوار ننھے کو کھاٹ پر چھوڑ کر اپنا داہنا ہاتھ داہنے گھٹنے پر رکھ کر نحیف ولاغر قدموں کے سہارے کھڑی ہوگئی۔ وہ بغیر کسی کے سہارے نہ تو اٹھ سکتی تھی اور نہ چل سکتی تھی۔ پھر بھی اس نے کبھی بیساکھی کا استعمال نہیں کیا کیوں کہ بچپن سے لے کے آج تک اس کے ارد گرد کوئی نہ کوئی اس کی مدد کے لیے حاضر رہتا۔ رانی یہ سوچ رہی تھی کہ رضا کی آنکھیں اپنے بچے کے دیدار کے لیے ترس رہی ہوں گی۔ رانی اپنی سوچ میں بالکل حق بجانب تھی۔ کیوں کہ رضا گھر میں داخل ہوتے ہی اپنے بچے کو گود میں اٹھا کر بوسہ پر بوسہ لینے لگا۔

حامد گھر پر نہیں تھا۔ وہ اپنے وکیل کے گھر گیا ہوا تھا تاکہ کسی ترکیب سے اپنے بھائی راشد پر کوئی مقدمہ دائر کر کے انتقام کی آگ بجھا سکے۔ رضا ایک ڈبہ مٹھائی لے کر آیا تھا۔ اور اس کا یہ عمل باعث تعجب تھا کیوں کہ ریتا ورسم کے باوجود وہ پہلے کبھی اپنے رشتہ داروں کے یہاں مٹھائی لے جا کر مہمان نہیں بنا تھا۔ اس سے رانی کو بھنک لگ گئی تھی کہ کچھ نہ کچھ ضرور خاص بات ہوئی ہوگی۔ رضا رانی کو خوش خبری سنانے کے لیے مناسب خلوت کی تاک میں تھا۔ رانی کی امی رضا کے لیے شربت وغیرہ لانے کچن چلی گئی۔ رضا کو اسکول کی منظوری کے سلسلے میں رانی سے گفتگو کرنے کا مناسب وقت مل گیا۔

یہ دلنواز بشارت سن کر خوشی سے رانی کی باچھیں کھِل گئیں۔ وہ بہت خوش ہوئی کیوں کہ اس کا شوہر برسہا برس غربت وافلاس کے ساتھ برسرِ پیکار رہنے کے بعد آج کامیابی کی منزل پر کھڑا تھا۔ رضا رانی کو اپنے ساتھ لے جانا چاہتا تھا۔ مگر وہ اسی دن نہیں لے جا سکا۔ کیوں کہ حامد کی اجازت کے بغیر رانی کو اپنے ساتھ لے جانا مناسب نہیں تھا۔ اس لیے اس نے اس رات سسرال ہی میں قیام کرنے کا فیصلہ کیا۔ رضا دن بھر اپنے بیٹے کے ساتھ دل بہلاتا رہا اور رانی سے باتیں کرتا رہا۔ اس کے دل میں ارمانوں اور امنگوں کا جو طوفان مچل رہا تھا، جو عزائم اور منصوبے اس نے بنا رکھے تھے اور جو باتیں آج تک اس کے دل کے تہہ خانوں میں دبی ہوئی تھیں آج اس نے رانی کے سامنے تمام احساسات وجذبات کا برملا اظہار کر دیا تھا۔ دونوں اپنے اکلوتے ننھے راج کمار کے ساتھ بے حد خوش تھے۔ حامد دیر رات گھر آیا۔ دروازے پر کھڑی سائیکل دیکھ کر وہ اتنا تو سمجھ گیا کہ کسی مہمان کی آمد ہوئی ہے مگر وہ ہے کون؟ اس کا اندازہ لگانے سے قاصر رہا۔ جب وہ گھر کے اندر داخل ہوا تو اس کے کانوں میں رضا کی آواز آئی۔ رضا کی آواز سنتے ہی اس کے دل کی دنیا بدل گئی اور وہ خوشی سے جھوم اٹھا۔ رانی نے بعد میں اپنے ابّا سے رضا کے آنے

کا مقصد ذکر کیا۔ حامد نے دونوں کو باخوشی رخصت کی اجازت دے دی۔ رانی کا چھوٹا بھائی جاوید اسکول میں پڑھائی کرتا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ عابد کی طرح اس کو بھی حامد مدرسہ میں داخل کرنا چاہتا تھا مگر عابد جس کو مدرسہ کے بارے میں تلخ تجربہ حاصل تھا وہ اپنے عزیز بھائی کو مدرسہ کی قربان گاہ میں بھیجنے سے بالکل متفق نہیں تھا۔ اسی کے اصرار سے حامد نے جاوید کا داخلہ اسکول میں کروایا تھا۔ اسکول ان کے گھر سے ایک کلومیٹر کی مسافت پر تھا۔ اس لیے رانی نے خود اس کو اسکول جانے کے لیے تیار کیا۔ اسکول جاتے وقت وہ تھوڑا اداس تھا کیوں کہ اس کو معلوم تھا کہ اسکول سے لوٹنے کے بعد اس کا خیر مقدم کرنے کے لیے اس کی آپا جان نہیں رہے گی۔ رانی بھی اس غم میں رو پڑی۔ رانی نے اس کے 'لنچ باکس' میں چوری چھپے دو عدد زیادہ مٹھائیاں رکھ دیں۔ لیلیٰ کو ابھی ان سب چیزوں کا شعور نہیں تھا۔ عابد ان کے لیے کرایے کا تانگا بلانے چلا گیا۔ رانی کی امّی نے اپنے نواسے کو نہلا دھلا کر خوب لاڈ پیار کیا۔ تانگا آکر دروازے پر کھڑا ہو گیا اور پھر دم زدن میں رضا، رانی اور ننھا شہزادہ سب نظروں سے اوجھل ہو گئے۔ رضا جب اپنے گھر سے روانہ ہوا تھا تب اس کے گھر پر خوشی کے شادیانے بج رہے تھے مگر جب وہ لوٹا تب گھر کا ماحول تقریباً ماتم کناں تھا۔ رضوان منھ لٹکائے باہر برآمدے میں بیٹھا ہوا تھا۔ شینو کچن میں تھی اور وہ بھی کچھ زیادہ خوش نہ تھی۔ ڈاکٹر صاحب بھی رونی صورت بنائے بیٹھے تھے۔ رضا جب اپنی آل اولاد کے ساتھ تانگے سے نیچے اترا تب کسی نے اس کا خیر مقدم نہیں کیا۔ بستی کے کچھ لوگ مجیب کو گالیاں بک رہے تھے اور دھوکے باز اور فریبی جیسے القابات سے نواز رہے تھے۔ رضا دو بھاری بھر کم تھیلے لے کر اترا۔ ان تھیلوں میں گیہوں، چاول اور مکئی بھرے ہوئے تھے۔ ان تھیلوں کو دیکھ کر شینو کی آنکھیں حیرت سے کھلی کی کھلی رہ گئیں کیوں کہ اس طرح کے تحفے اور سندیسے کبھی اس کے مائیکے سے نہیں آئے تھے۔ مجیب نے آگے بڑھ کر

بچے کو گود لیا اور لاڈ پیار کرنے لگا۔ اپنے بھتیجے سے پہلی ملاقات تھی اس لیے وہ بہت خوش تھا۔ مگر اس کے چہرے پر خوشی کی وہ لہر نہیں تھی جو ہونی چاہیے۔ ''ضرور کچھ نہ کچھ دال میں کالا ہے'' رضا نے سوچا۔ ساز و سامان کمرے میں رکھ کر رضا فوراً ڈاکٹر صاحب کے پاس گیا۔ اور گھر میں سب کے غمگین ہونے کی وجہ دریافت کی۔ ڈاکٹر صاحب نے رضا کو بتایا کہ حکومت سے منظور شدہ اساتذہ کی فہرست میں جہاں بارہ اشخاص کے نام ہونے چاہیے وہاں صرف چھ لوگوں کے ہی نام مندرج ہیں۔ ''کیا اپنی فیملی سے بھی کسی کا نام غائب ہے؟'' رضا نے عرض کیا۔

''مسئلہ وہ نہیں ہے۔ مسئلہ تو یہ ہے کہ ساری داستان مجیب کو معلوم ہونے کے باوجود بھی اس نے ہمیں نہیں بتایا۔ اور اس پر ظلم یہ کہ اس نے رضوان کا نام ہٹا کر اپنی بیوی کا نام گھسیڑ دیا ہے۔ اس لیے اب رضوان بیچارہ بے روزگار ہی رہے گا جبکہ ادھر مجیب اور اس کی پتنی دونوں ہی عیش موج کریں گے۔ اور دوسری بڑی مصیبت یہ ہے کہ مجیب نے اس بستی کے ایسے تین لوگوں کا نام اس فہرست سے خارج کر دیا ہے جنہوں نے دن رات ایک کر کے بلا کسی اجرت کے اسکول کے لیے بھاگ دوڑ کیا تھا۔'' ڈاکٹر صاحب نے رضا کو پوری کہانی سنائی۔

''مجیب بھائی ایسا کیسے کر سکتے ہیں؟ یہ تو حکومت کے ہاتھ میں ہے کہ کس کو منظوری دینی ہے اور کس کو نہیں۔'' رضا نے اپنے بھائی کا دفاع کرنے کی کوشش کی۔

''مسئلہ تو یہی ہے کہ یہ سب مجیب ہی کی کارستانی ہے۔ اس نے دو سابق اساتذہ سے دس دس ہزار روپے طلب کیے ہیں۔ وہ دونوں بروقت پیسے نہیں دے سکے اور اب مجیب بقیہ چھ لوگوں سے رشوت لے کر ان کو تقرری نامہ دینے جا رہا ہے۔ میرا اپنا بیٹا اس حد تک حقیر اور ذلیل حرکت کر رہا ہے۔ خدا کی پناہ! میں نے کبھی بھی اس کو بے ایمانی اور فریب دہی

کی تعلیم نہیں دی۔''ڈاکٹر صاحب بہت اداس اور ملول تھے۔

رضا بھاری قدموں سے باہر آیا۔رضوان کے پاس جا کر اس کو تسلی دینے کی کوشش کی۔''کوئی بات نہیں! میرے پاس اضافی صلاحیت نہیں ہے یا میں بہت زیادہ تعلیم یافتہ نہیں ہوں تو کیا ہوا؟۔کوئی حرج نہیں! میں اور بھی بہت کام کر سکتا ہوں۔مثلاً دوسروں کے کھیت جوت کر اپنا پیٹ بھر سکتا ہوں۔''

رضوان کے دل کا آبگینہ ٹوٹ کر بکھر چکا تھا۔اس نے تولیے میں اپنے آنسو جذب کیے اور پھر یوں گویا ہوا،''آپ کو تو نوکری مل گئی نا؟ اب آپ سرکاری ملازم ٹھہرے۔فخر ہے آپ پر۔آپ کا منہ میٹھا کرنے کے لیے مٹھائیاں خریدنے جا رہا ہوں۔یقین کریں مجھ پر۔میں آپ کے حال سے بہت خوش ہوں''ماحول میں جذبات کا ایک محشر بپا تھا۔رضا اس کی تاب نہ لا سکا اور اپنے کمرے میں چلا گیا۔آدھے گھنٹے میں دوپہر کے کھانے کا وقت ہونے والا تھا۔روزانہ کی طرح رضا اپنے کمرے سے نکلا اور ہاتھ واتھ دھو کر برآمدے میں بیٹھ گیا جہاں تینوں بھائی ایک ساتھ بیٹھ کر روزانہ کھانا کھایا کرتے تھے۔وہ بیٹھ کر انتظار کرتا رہا مگر اس کے گھر کا کوئی فرد کھانا کھانے نہیں آیا۔آخر وہ اٹھ کر اپنے کمرے میں چلا گیا اور رانی سے کھانا لانے کی گزارش کی۔رانی جب کچن میں کھانا لانے گئی تو اس کو بڑی حیرت ہوئی کیوں کہ وہاں کھانے کے لیے ایک بھی دانہ نہیں بچا تھا۔اس نے شینخو سے کھانا کی بابت دریافت کیا۔''میں تمہاری نوکرانی نہیں ہوں۔سمجھی؟ اگر کھانا چاہتی ہو تو خود سے پکا کر کھاؤ''شینخو جواب دے کر اپنے کمرے میں چلی گئی۔روم میں داخل ہوتے وقت وہ زیرِ لب کچھ کہہ رہی تھی''مجھے سرکاری نوکری کیا ملی کہ اس گھر میں ہر کسی کا منہ لٹک گیا۔برسوں سے اس گھر میں ایک خادمہ کی طرح کام کرتی آئی ہوں اور اب بھی یہ لوگ مجھے نوکرانی ہی بنا کر رکھنا چاہتے ہیں''رانی اتنا ہی سن سکی۔باقی بھڑاس شینخو نے اپنے کمرے میں

نہایت آہستہ آواز میں نکالی۔ دوپہر میں رانی نے خود پکانے کا فیصلہ کیا۔ مگر جیسے ہی اس نے پکانا شروع کیا شینخو وہاں نمودار ہوئی اور بکنے لگی ''یہ راجکماری کچن کو اپنی تحویل میں لینا چاہتی ہے۔ اور میری تمام ذمہ داریوں کو چھیننا چاہتی ہے۔'' شینخو کی آواز سن کر رانی لاجواب ہوگئی اور اپنے کمرے میں چلی گئی۔

وہ کئی شب قناعت کی حالت میں گزار سکتی تھی مگر اس کی حمیتِ مادری کو یہ گوارا نہیں تھا کہ اس کا شیر خوار بچہ بھوکے پیاسے رات گزارے۔ اس لیے اس نے رضا سے الگ دودھ لانے کے لیے کہا۔ اب رانی کو احساس ہوا کہ مشترکہ فیملی میں اس کی والدہ کو کتنے جتن کرنے پڑے ہوں گے۔ مشترکہ فیملی میں اپنے بچوں کی پرورش کرنے میں کتنے پاپڑ بیلنے پڑے ہوں گے۔ رضا بھی علاحدہ دودھ خریدنے لگا۔ رانی دن بھر گھر کے کام میں مصروف رہا کرتی تھی۔ اور جب کچن میں کھانا باقی نہ بچتا وہ اسی دودھ کے دو چار گھونٹ پی کر سو جاتی۔ اسی گھٹن کی زندگی میں برسوں بیت گئے۔

ایک روز وہ سخت بیمار پڑ گئی۔ رضا اس کو محلے کے ڈاکٹر کے پاس لے گیا۔ ڈاکٹر نے اس کو شہر کے اسپتال لے جانے کا مشورہ دیا۔ ڈاکٹر نے بتایا کہ بخار اور کھانسی کی مختلف وجہ ہوسکتی ہے۔ ڈاکٹر کے مشورہ کے مطابق رضا اس کو شہر لے گیا جہاں ڈاکٹر نے ایکسرے کرانے کی صلاح دی۔ وہاں الٹراساؤنڈ کی سہولت نہیں تھی۔ شام اپنی سیاہ زلف بکھیر چکی تھی اس لیے پیتھولوجسٹ (ماہر تشخیصِ امراض) نے ان سے کہا کہ رپورٹ اگلے دن تک ملے گی۔ رانی سخت بیمار تھی۔ ایک طرف تو اس کو زبردست بخار تھا اس پر اس کی کھانسی قابو میں نہیں تھی۔ رضا نے اس کے لیے کچھ پھل پھلوری خریدا۔ ان دنوں رانی کی زبان سے ذائقہ اتر گیا تھا۔ انہوں نے شب اسپتال میں گزاری۔ اسپتال میں کمرہ کرایہ لینا رضا کے بساط سے باہر تھا۔ رواج کے مطابق سفر میں ان کے ساتھ ایک چادر رہا کرتی تھی جس

کو بوقت حاجت بچھایا کرتے تھے۔ اسپتال کی غلام گردش میں وہی چادر پھیلا کر سو گئے۔ ایک ڈاکٹر نے رانی کو کھانستے ہوئے دیکھا اور دیکھا کہ وہ اس حالت میں فرش پہ لیٹنے پر مجبور ہے تو ڈاکٹر نے ان کو کمرہ لینے کا مشورہ دیا۔ اگرچہ کمرہ کرایے پہ لینے کی حیثیت نہیں تھی تاہم ڈاکٹر نے ان کو ایک کمرہ یونہی ازراہِ ہمدردی دے دیا۔ کمرہ بہت اچھا اور نہایت آراستہ وپیراستہ تھا۔ رضا بہت خوش ہوا اور فوراً جا کر یہ خبر رانی کو سنائی۔ رانی رضا سے کچھ کہنا چاہتی تھی مگر اس کی آواز اس کی کھانسیوں میں دب کر رہ گئی۔ رضا نے اس کو پانی پلایا اور اپنے سہارے کمرے میں لے گیا۔ رانی کو جب تھوڑا آرام محسوس ہوا تو اس نے ایک حقیقت کا انکشاف کیا ''میں نے اپنی آنکھوں سے ڈاکٹر صاحب کو واچ مین کو پیسے دیتے دیکھا ہے۔ کیا ڈاکٹر بھی اتنے مہربان ہوتے ہیں؟''

رضا اور رانی نے اسپتال کے کمرے میں رات گزاری۔ اگلی صبح ڈاکٹر صاحب نے ''صبح بخیر'' کہہ کر ان کو جگا دیا۔

''اب کیسا محسوس کر رہی ہو؟ میرے پاس تمہاری رپورٹ ہے رانی۔''

''جی سرکار! بتائیں رپورٹ میں کیا ہے؟ سب ٹھیک اور نارمل ہے نا؟''

رضا نے اشتیاق وتجسس کے ساتھ پوچھا۔

''میں نے اب تک رپورٹ نہیں پڑھی ہے۔ کیوں نہ چل کر بیٹھ کر اس کے متعلق بات چیت کرتے ہیں۔ آئیں ہمارے ساتھ'' ڈاکٹر نے کہا۔

رضا کو بالکل عجیب سا لگا کہ ایک ڈاکٹر صاحب خود اس سے بات کرنا چاہتے ہیں۔ رضا اس کے ساتھ چلا گیا۔ ڈاکٹر نے لفافہ کھول کر ایک رپورٹ باہر نکالی۔ رپورٹ پڑھتے وقت ڈاکٹر کی پیشانی کا رنگ تبدیل ہونے لگا۔ ''ڈاکٹر صاحب! کیا کوئی بڑی بیماری کی رپورٹ آئی ہے؟''

''ہاں، آئی ہے۔ اس کو''ٹیوبر کیولوسس'' (تپ دق) کہتے ہیں''۔

اس کا کوئی معنٰی و مطلب رضا کی سمجھ میں نہیں آیا۔ اس سے قبل یہ لفظ اس نے کبھی نہیں سنا تھا اس لیے اس سے یہ معمہ حل نہیں ہوا۔

''چند سالوں پہلے 'ٹیوبر کیولوسس' ایک لاعلاج بیماری تھی۔ سائنس دانوں نے اس کا علاج دریافت کرلیا ہے۔ اب یہ بیماری لاعلاج نہیں ہے۔ لیکن اس کے لیے تم کو اگلے نو مہینے تک مخصوص دوائیوں کی خوراک لینی ہوگی۔ ڈاکٹر صاحب کافی سنجیدہ تھے اس لیے رضا قدرے گھبرا سا گیا۔

ڈاکٹر صاحب کی وضاحت اس کی سمجھ سے بالاتر تھی۔

''اب میں جو کہنے جارہا ہوں اس کو غور سے سنو'' ڈاکٹر صاحب نے مزید کہا ''اس مرض کی دوائیاں مارکیٹ میں نہایت مہنگی ہوتی ہیں۔ حکومت ان دوائیوں میں تھوڑی بہت سبسڈری دیتی ہے اس لیے بہتر ہے کہ یہ دوائیاں حکومتی اسپتال سے ہی لی جائیں۔ دوسری ہدایت یہ ہے کہ اس کو بلاناغہ روزانہ مسلسل نو مہینے دوائیاں لینی ہونگی۔ ایک بھی دن ناغہ کی صورت میں پھر اسی دن سے نو مہینے کی ابتداشمار کی جائے گی۔''

''تیسری ہدایت یہ ہے کہ تم کو اس کا بہت خیال رکھنا ہوگا۔ یہ ایک نہایت خطرناک بیماری ہے۔ اس کے کھان پان کا بہت زیادہ خیال رکھنا ہوگا۔ جو کچھ بھی وہ کھانا چاہے اس کو خرید کر کھلاؤ مگر یہ خیال رکھو کہ وہ ایک وقت بھی بھوکی نہ رہے۔ اس کا کھانا بھی اس کی دوائی کا حصہ ہے۔ اس بیماری کو ہلکے سے مت لینا۔ یاد رکھو کہ ماضی میں اسی مرض نے کتنوں کی جانیں لے لی ہیں۔ یہ ایک جان لیوا بیماری ہے''

''تم خوش قسمت ہو کہ چند سالوں پہلے اس کا علاج دریافت ہوگیا'' ڈاکٹر صاحب اس بیماری کے ایک ایک پہلو پر روشنی ڈالے جارہے تھے جیسے کوئی بچے کو چاند میں دھبے

کا سبب بتا رہا ہو۔

رضا ڈاکٹر صاحب کے چیمبر سے تیز قدموں کے ساتھ واپس آیا۔ اس نے رانی کو ساری بات بتائی۔ رانی رضا کی باتیں سن کر خیالوں میں کھوگئی۔ اس کو بس یہی فکر اندر ہی اندکھائے جارہی تھی کہ اگر خدانخواستہ اس کا انتقال ہوگیا تو اس کے بعد اس کے بچے کی دیکھ بھال کون کرے گا؟ رضا اس بات سے بے خبر نہیں تھا کہ شینخو کی نگرانی میں رانی کا علاج ممکن نہیں ہے۔ اس لیے اس نے رانی کو اس کے مائیکے بھیجنے کا فیصلہ کیا تا کہ وہاں اس کے والدین اس کی بہتر نگرانی کر سکیں۔

گھر لوٹنے کے بجائے وہ حامد کے گھر چلے گئے۔ رضا نے ان کو اپنی داستانِ غم سنائی۔ اور نہایت صبر آمیز لہجے میں اس نے ایک ایک حالت و کیفیت کی وضاحت کر دی۔ حامد بھی اس کی باتیں سن کر رانی کو اپنی نگرانی میں رکھنے کے لیے راضی ہوگیا۔

☆☆☆

تیرہواں باب

''میں جانتی تھی کہ اس لڑکی کی جان میں کچھ دم خم نہیں ہے۔اس سے شادی کر کے بہت بڑی غلطی ہوگئی ہے۔ یہ رشتہ ہم لوگوں کی شان کے لائق ہی نہیں تھا۔اب دیکھ نتیجہ سامنے ہے۔آج وہ ٹی بی کی مریض ہے کچھ دنوں میں مرمٹ جائے گی۔پھر کیا ہوگا؟''

شینخو اپنی عادت کے مطابق تیز آواز میں بڑبڑا رہی تھی۔

''میرے خیال سے وقت اور پیسے کی بربادی سے بہتر ہے کہ رضا کا دوسرا نکاح کرا دیا جائے۔'' رضوان نے رائے ظاہر کی۔

ڈاکٹر صاحب چپ چاپ سب کی بات سن رہے تھے۔انہوں نے مجیب کو بلا کر ان تمام حالات وکوائف پر رضا سے گفتگو کرنے کا مشورہ دیا۔اور یہ پتہ لگانے کہا کہ رضا کے من میں کیا چل رہا ہے۔

رضا کے چہرے پر غم واندوہ کے آثار چھائے ہوئے تھے۔

''میں نے رانی کو چھوڑ کر دوسرا نکاح کرنے کے بارے میں سپنے میں بھی کبھی نہیں سوچا۔ایسا کرنا میرے نزدیک ایک احمقانہ حرکت ہے۔وہ میری شریکِ حیات ہے۔اس نے اپنا خون جگر صرف کر کے میرے ایک بچے کو جنم دیا ہے۔میں اپنی فیملی کو تاراج نہیں کرنا چاہتا'' یہی رضا کا ردِعمل تھا جب مجیب نے اس کو دوبارہ نکاح کرنے کی صلاح دی

تھی۔

''پھر کیا کریں گے؟ یہی نا کہ پہلے اس کے علاج میں بے دریغ پیسے بہائیں گے پھر اس کی موت کا تماشا دیکھیں۔ اور پھر اس کی موت کے بعد آخر کار دوسری شادی کا جشن منائیں گے۔ یہ کوئی دانشمندی نہیں ہے''۔ رضوان نے جھنجھلا کر کہا۔

''یہی تو حقیقی دانشمندی ہے۔ اس کا نام بیماری ہے۔ یہ کسی کے گھر اجازت لے کر نہیں آتی۔ سوچو اگر یہی تمہیں یا مجھے لاحق ہو جائے تو؟ تب بھی یہی کہو گے؟ میری فیملی میرا ساتھ دے یا نہ دے میں اس کا علاج کراؤں گا۔ وہ میرے بچے کی ماں ہے۔ اس مصیبت کی گھڑی میں میں اس کو تنہا نہیں چھوڑ سکتا۔ میں دوبارہ نکاح نہیں کرنے والا۔ اس کو یہ بیماری اس لیے لگی کیونکہ اس فیملی نے اس کے ساتھ دوہرا سلوک کیا۔ میں دوبارہ نکاح کر کے یہی کہانی نہیں دہرانا چاہتا۔'' رضا نے بلا کسی خوف کے برملا اپنے دل کا بھڑاس نکال دیا۔ شیخو اپنے کمرے میں چھپ کر اس کی ساری باتیں سن رہی تھی۔ اس کے لیے خاموش رہنا اب برداشت سے باہر ہو رہا تھا۔ پیچ و تاب کھاتے ہوئے وہ باہر آئی اور رضا پر برس پڑی۔ ''تم کیا کہنا چاہتے ہو؟ یہی نا کہ تماری جورو کی بیماری کا سبب میں ہوں اگر تمہارا یہ خیال ہے تو تمہیں بھی اپنے دماغ کا علاج کرانے کی ضرورت ہے۔ مجھ سے بہتر گھر کی دیکھ ریکھ کرنے والی چراغ لے کر بھی ڈھونڈو گے تو نہیں ملنے والی۔'' وہ جتنا بول سکتی تھی بولی اور پھر رونے دھونے لگی۔ مجیب نے بڑھ کر اس کو تسلی دی۔

اب رضا کے سامنے یہ عُقدہ صاف کھل گیا کہ کیوں اس کی بیوی آج زندگی اور موت کے درمیان ہے اور کس وجہ سے رانی اس فیملی کے بارے میں شکوے گلے کرنے پر مجبور تھی۔ رضا نے اس مشترکہ فیملی سے علاحدہ ہونے کا فیصلہ کر لیا۔ مگر پھر وہ ایک لمحے کے لیے رک گیا۔ اور رضوان سے کہنے لگا۔ ''دیکھ رضوان! میں اب اس مشترکہ فیملی سے تنگ

آچکا ہوں ۔ لیکن میں تم کو مصیبت میں نہیں ڈالنا چاہتا۔ میں جانتا ہوں کہ تم بے روزگار ہو اور وہ تمہارے عزیز بھیا اور بھابھی کی محبت کا بہترین صلہ ہے۔ میں یہ سب صرف تمہاری خاطر برداشت کر رہا ہوں۔ میں نے سب کچھ میں بٹوارے کا فیصلہ کیا ہے۔ یہاں تک کہ ابا کی ملکیت، کچن اور اس گھر میں بھی۔ تمہاری کیا رائے ہے؟'' رضا نے رضوان سے پوچھا۔

رضا کی باتیں سن کر رضوان کا چہرہ غصہ سے سرخ ہو گیا۔

''اگر آپ نے پہلے ہی فیملی کے اتحاد اور ناموس کو خاک میں ملانے کا فیصلہ کر ہی لیا ہے تو برائے کرم میرے سامنے یہ مگرمچھ کے آنسو مت بہائیں۔ میں اپنے بڑے بھائی کے ساتھ ہی بہت خوش ہوں۔ آپ مجھے گھر سے نکال سکتے ہیں مگر وہ کبھی نہیں۔ اور اگر انہوں نے بھی ایسا ہی سلوک کیا تو میں خود کوئی راہ نکال لوں گا۔ میں کوئی لاشعور بچہ نہیں ہوں۔ میں اپنی زندگی اپنے بل بوتے پر گزار سکتا ہوں۔'' رضوان تقریباً چلا اٹھا۔ رضا اس کی باتیں سنے بغیر وہاں سے چلا گیا۔

رضا بستر پر لیٹ کر بچپن کی سنہری یادوں کے بھول بھلیوں میں کھو گیا۔ کتنے سنہرے دن تھے وہ۔ اس کو اپنے بھائیوں کی پشت پناہی پر کتنا ناز تھا۔ زمانے نے کیسی پلٹی ماری کہ سب کچھ بدل گیا۔ اس کو تنہائی کی خلش محسوس ہو رہی تھی۔ وہ اپنی پریشانی چھپا نہ سکا۔ اس نے اپنے چہرے پر ہاتھ پھیرا جو آنسوؤں سے تر بتر تھا۔

یہ حقیقت ہے کہ ایک باپ ہی اپنے بیٹے کے احساسات کو اچھی طرح سمجھ سکتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب اس کے کمرے میں داخل ہوئے۔ اور رضا کے سرِ بالیں بیٹھ کر اس کے سر پر دستِ شفقت پھیرتے ہوئے یوں گویا ہوئے ''فکر کی چنداں ضرورت نہیں ہے۔ میں ہمیشہ تمہارے ساتھ ہوں۔ یہ وقت تو ایک نہ ایک دن آنا ہی تھا۔ میرے خیال سے یہی تمہاری

زندگی کی سب سے بہتر گھڑی ہے۔ نئے طرز زندگی کی شروعات کرو اور اپنے پیروں پر کھڑے ہو جاؤ۔ میں ہمیشہ تمہارے فیصلوں کی قدر کرتا ہوں۔

کبھی مت سوچو کہ تم اکیلے ہو۔ میں کچھ کام سے ضلع کے باہر جا رہا ہوں۔ میں ایک ہفتہ کے اندر اندر واپس لوٹوں گا اس لیے خیال رہے کہ میری آمد سے قبل کوئی غلط قدم مت اٹھانا'' ڈاکٹر صاحب یہ کہہ کر چلے گئے۔

ابا کی حمایت پا کر رضا کی جان میں جان آئی۔ رضا آج تک کبھی اپنے بارے میں صحیح فیصلہ نہ لے سکا۔ اس سانحہ کے بعد تینوں بھائیوں کی باہمی گفتگو بھی بند ہو گئی۔ اندر ہی اندر ایک سرد جنگ چھڑ چکی تھی۔ ان سب کو اب ڈاکٹر صاحب کی آمد کا انتظار تھا۔

رانی کی حالت رفتہ رفتہ غیر ہو رہی تھی۔ وہ شدید کھانسی سے بے حال تھی اور کبھی کبھی تیز بخار کا دورہ آتا تھا۔ اس کے ابا اور امی اس کو اپنی پلکوں پہ بٹھا کر رکھے ہوئے تھے۔ اس کا بچہ بھی وہیں اپنی نانی کے آغوشِ تربیت و محبت میں تھا۔ وہ اپنی نانی کا سب سے زیادہ محبوب تھا۔

حامد اپنے بھائی راشد کو جائداد کے جھگڑے کے سلسلے میں پھانسنے میں کامیاب ہو گیا۔ راشد جلد ہی گرفتار ہونے والا تھا۔ حامد نے برسہا برس جس لمحے کا انتظار کیا تھا وہ لمحہ اب آنے والا تھا۔ عابد بھی خوش تھا کیوں کہ اس نے کھیتوں میں متعدد مرتبہ اپنے چچا کے ظلم وستم دیکھے تھے۔ جاوید ان چیزوں سے اتنا نادان تھا کہ وہ اس دن بھی راشد کے بیٹے کے ساتھ دن بھر کرکٹ کھیلتا رہا جس دن راشد اپنے وکیلوں سے مقدمہ سمجھ رہا تھا اور جائیداد کے قانونی دفعات سے بچنے کی راہ تلاش کر رہا تھا۔

حامد کی بیوی رانی کو لے کر قدرے اداس اور ملول تھی۔ اس کو یہ خدشہ تھا کہ ہونہ ہو رضا رانی کو چھوڑ دے۔ کیوں کہ وہ پہلے ہی اپاہج تھی اور اب ٹی بی کی مریض ہے۔ اس

نے یہ خدشہ رانی اور حامد سے ظاہر کیا مگر حامد نے اس کو سنجیدگی سے نہیں لیا۔

رانی نے اپنی اماں سے کہا ''مجھے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ میں نے ایک بیٹا جنم دیا ہے۔ میں اس کے بڑے ہونے کا انتظار کروں گی اور پھر جب وہ کمانے کے لائق ہو جائے گا اس کے بعد میں کسی کی محتاج نہیں رہوں گی۔''

رانی کا بیٹا اس کا سرمایۂ افتخار تھا۔ ''اس کے جوان ہونے میں سولہ سال لگ جائیں گے۔ تمہیں بہت طویل انتظار کرنا ہوگا''۔ اس کی ماں نے اس سے کہا۔

''وقت آندھی کی رفتار سے گزر جاتا ہے'' رانی نے اضافہ کیا۔

اس کی ماں فرطِ محبت سے مچل اٹھی ۔ آگے بڑھ کر بیٹی کے ماتھے پر بوسہ دیا اور نصیحت کرنے لگی ''خدا تم پر رحم کرے! مجھے بس یہی حسرت رہ گئی کہ تمہیں اچھی تعلیم نہ دے سکی۔ درحقیقت میں اپنی کسی اولاد کو تعلیم کے زیور سے آراستہ نہ کر سکی۔ اس لیے ہمیشہ یاد رکھو کہ اپنے بیٹے کو خوب لکھانا پڑھانا ہے''

رانی اپنے مُنّے کو گود میں لے کر اس سے کہنے لگی ''میں تمہیں ہر قیمت پر پڑھاؤں گی۔ تمہیں تعلیم دینے کے لیے ہر بھاری پتھر اٹھانے کو تیار ہوں۔ میں تمہیں ایک پروفیسر کی شکل میں دیکھنا چاہتی ہوں تاکہ تم معاشرہ کی خدمت کر سکو۔ یہی میرا سپنا ہے۔ پھر مجھے وہ ساری خوشیاں مل جائیں گی جو میں اپنی زندگی میں پانا چاہتی تھی۔ روپے پیسے، نام، شہرت ہر چیز۔ جب لوگ مجھے ایک پروفیسر کی ماں کہہ کر پکاریں گے میرا سر فخر سے بلند ہو جائے گا اور مجھے حد درجہ یقین ہے کہ تیرے ابا کا سینہ بھی فخر سے چوڑا ہو جائے گا.........؟ رانی اس وقت تک کہتی رہی جب تک کھانسی نے اس کا منہ نہیں بند کر دیا۔

اس کی ماں ایک گلاس پانی لے کر آئی اور کہنے لگی ''تمہارے خواب کی پہلی منزل تمہاری صحت ہے۔ تمہارے خواب اسی وقت شرمندۂ تعبیر ہو سکتے ہیں جب کہ تم صحت یاب

رہو۔ خود کو صحت یاب رکھنے کی کوشش کرو۔"

پولیس راشد کی گرفتاری کے لیے آ گئی۔ حامد اس کو جیل جاتا دیکھنے کے لیے بے تاب تھا۔ مگر اچانک کوئی ایک بڑے سے کار میں آیا اور نہ جانے پولیس کے کان میں کون سا منتر پھونکا کہ وہ افسر راشد کو گرفتار کیے بغیر الٹے قدم واپس چلا گیا۔ یہ حادثہ حامد کے لیے نہایت مایوس کن تھا۔ کیوں کہ سالہا سال تک حامد نے اپنے سینے میں جس آرزو کی پرورش کی تھی دم زدن میں وہ کافور ہوگئی۔ حامد کو اپنی ناکامی برداشت سے باہر معلوم ہو رہی تھی۔ تبھی اس کے حافظے میں اس کے وکیل کی آواز گونجی "میرا دعویٰ ہے کہ اس کو کوئی ماں کا لال بچا نہیں سکتا۔ اس کو جیل کی دھول چاٹنی ہوگی" حامد اپنے آپے سے باہر ہو رہا تھا۔ اگر اس وقت اس کا وکیل وہاں آ جاتا وہ اس کو جان سے مار ڈالتا۔ راشد کے گھر پر تماشائیوں کی بھیڑ اکٹھی ہو چکی تھی۔

حامد اس تماشا کی تاب نہیں لا سکتا تھا اس لیے وہ اپنے کمرے میں چلا گیا۔ ابھی وہ اندر داخل ہوا ہی تھا کہ کسی نے دروازے پر دستک دی۔

"کون؟" حامد نے چلا کے کہا۔

"پولیس" اس نے آواز سن کر فوراً دروازہ کھول دیا۔ سامنے اس کا وکیل اور دو پولیس افسر کھڑے تھے۔

حامد اپنے غصے پر پردہ ڈالتے ہوئے مسکرانے کی کوشش کی اور اندر کی جانب ان کا استقبال کیا۔

"دراصل وہ ایک قابل ضمانت وارنٹ تھا۔ اس لیے اس بار وہ بچ کر نکل گیا۔ اب میں راشد کے خلاف ایسا جال بچھانے جا رہا ہوں جس سے بچ نکلنا اس کے بس کی بات نہیں۔ اس بار کم سے کم دو ہفتے تک اس کو جیل کی ہوا کھانی ہوگی۔ اس لیے آپ پریشان نہ

ہوں۔''

اس کے وکیل نے اس کو بڑے اعتماد کے ساتھ یقین دہانی کرائی۔

حامد کو جواب میں کچھ نہ سوجھا اس لیے اس نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔''میں اپنی زندگی کی آخری سانس تک انتظار کر سکتا ہوں مگر میں کسی بھی صورت میں اس کو جیل کی سلاخوں کے پیچھے دیکھنا چاہتا ہوں۔ میں جیل کی اس ہیبت ناک رات کو کبھی نہیں بھول سکتا۔ میری کیا غلطی تھی؟

کیا میں کوئی غنڈہ تھا؟'' حامد نے اپنے وکیل سے کہا۔

☆☆☆

چودھواں باب

ڈاکٹر صاحب کو ایک ''کانٹریکٹ کمپنی'' میں نوکری مل گئی۔ کمپنی جانے کے لیے ان کو بذریعۂ بس سمستی پور جانا پڑتا تھا۔ یہ بہار روڈ ٹرانسپورٹ کارپوریشن کی بس تھی جو ہمیشہ مسافرین سے کھچا کھچ بھری ہوتی اور چالیس کلومیٹر فی گھنٹہ کی رفتار سے زیادہ تیزی سے چلنا اس کی اوقات سے بالاتر بات تھی۔ اور جب چلتی تو سڑک کے نشیب و فراز سے گزرتی ہوئی آواز میں ایسی جھنکار پیدا ہوتی کہ گویا یہ بس نہیں بلکہ کوئی کھانستی ہوئی بوڑھی عورت ہو۔ اور ڈرائیور بھی اسّی سال کا بڈھا پھونس تھا۔ لوگ بس کے اندر دھڑلے سے بیڑی سگریٹ پیتے تھے اور یہ بالکل عام بات تھی۔ مسافرین میں سے صرف ایک تہائی لوگ ہی سیٹ کی نعمت سے بہرہ ور ہو پاتے تھے اور باقی لوگ کھڑے کھڑے ہی سفر کرتے۔ بھیڑ کی وجہ سے بس میں تِل رکھنے کی جگہ نہیں ہوتی اور لوگ بلا کسی شکوہ گلا کے دھکم دھکی کھاتے ہوئے سفر کرتے۔ وہ یہی سوچ کیر صبر کر لیتے کہ بس دو گھنٹے کی تو بات ہے۔

ڈاکٹر صاحب اپنے صاحبزادوں کو ہمیشہ متحد دیکھنا چاہتے تھے جواب ناممکن نظر آرہا تھا۔ ان کا دل تھوڑا افسردہ تھا اور تھوڑا شگفتہ۔ خوشی اس بات کی تھی کہ ان کے بیٹوں کے پاس اب سرکاری ملازمت تھی اور غم یہ تھا کہ رضوان اب تک بے

روزگار تھا۔ ڈاکٹر صاحب کو امید تھی کہ اگر وہ اس پریشانی کا ذکر اپنے باس سے کریں گے تو وہ رضوان کے روزگار کی کوئی نہ کوئی راہ نکال دیں گے۔ ڈاکٹر انہیں خیالات میں گم تھے کہ اچانک بس نے سیٹی بجائی اور ڈاکٹر صاحب کے خیالات کی زنجیر ٹوٹ گئی۔ انہوں نے خود کو منزل رسیدہ پایا۔ کمپنی میں پہنچ کر انہوں نے اپنے باس سے اپنے بیٹے رضوان کی نوکری چاکری کے متعلق بات چیت کی۔ ان کے باس نے مثبت ردِعمل ظاہر کیا کیوں کہ وہ ڈاکٹر صاحب کی صداقت، راست بازی اور دیانت داری سے بے حد متاثر تھا۔ وہ خوشی سے جھوم اٹھے۔ ان کو شہر سے باہر کمپنی کا کچھ مال وغیرہ پہنچانا تھا اور پھر واپسی میں ان کو تنخواہ ملنے والی تھی۔ انہوں نے منصوبہ بنایا تھا کہ تنخواہ لے کر وہ گھر جائیں گے اور پھر ایک ہفتے کے اندر رضوان کے ساتھ کمپنی آئیں گے۔ مگر خدا کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ اپنے باس کے ساتھی کے یہاں مال و متاع پہنچا کر وہ واپس آ گئے۔

وہ فطرتاً ایک آدم دوست اور سماجی آدمی تھے۔ جہاں جاتے ڈھیر سارے دوست بنا لیتے۔ وہ جب بھی سمستی پور کی گلیوں سے گزرتے عادت کے مطابق گلی کے ہر دکاندار سے سلام دعا کرتے ہوئے گزرتے۔ اپنی اسی بھلی عادت کی وجہ سے وہ ہر کسی کے محبوب و محترم تھے۔

جمعہ کا دن تھا۔ ڈاکٹر صاحب جمعہ کی نماز ادا کر کے لوٹ رہے تھے۔ جیسی کہ ان کی عادت تھی، راستے میں انہوں نے درجنوں لوگوں سے سلام و مصافحہ کیا۔ جامع مسجد سے وہ تلکٹ چباتے چباتے گھر آ رہے تھے۔ ریلوے کے بالائی گزرگاہ سے گزرنے کے دوران ان کو سینے میں ایک دردِ ناگہانی محسوس ہوا اور وہ بے قابو ہو کر وہیں برج پر گر پڑے۔ وہ برج پر بے ہوش و حواس پڑے رہے یہاں تک کہ مسجد سے واپس لوٹتے چند دوسرے نمازیوں کی نگاہ ان پر پڑی۔ ان لوگوں نے ان کو وہاں سے اٹھایا اور قریب کے اسپتال میں داخل

کرادیا۔ دو چند منٹ کے بعد ایک ڈاکٹر ایک اسٹریچر (بیمار برداڈولی) کو دھکیلتے ہوئے آیا جس پر ڈاکٹر صاحب لیٹے ہوئے تھے اور ان کے جسم پر سفید چادر ڈھکی ہوئی تھی۔ ان کی داڑھی میں ابھی بھی چبایا ہوا تِلکٹ لگا ہوا تھا جو بہت بھدّا معلوم ہو رہا تھا۔ ''یہاں لائے جانے سے پہلے ہی وہ اللہ کو پیارے ہو چکے تھے'' ڈاکٹر ایک جملے میں ان کی موت کا فیصلہ کر گیا۔ یہ خبر سن کر وہاں موجود لوگوں کا چہرہ افسردہ ہو گیا اور لوگ ان کی خوبیوں کا ذکر کرنے لگے۔

''لاش کو ان کے گھر تک کون پہنچائے گا؟'' مجمع میں سے کسی نے پوچھا۔ ''میں'' مندر کے ایک پجاری نے سب سے پہلے ہاں کہہ کر فوراً یہ ذمہ داری قبول کر لی۔ یہ عجیب اتفاق تھا کہ وہاں بہت سارے مسلمان بھی تھے مگر ان میں سے کسی نے آگے بڑھ کر اس کارِ خیر میں حصہ نہیں لیا۔ ایک باریش صوم وصلاۃ کا پابند بوڑھا مردہ پڑا تھا اور ایک پنڈت جی کہہ رہے تھے کہ لاش کو اس کے گھر تک پہنچانے کا کام وہ انجام دیں گے۔ ابھی نا ہندوستان میں مسلمانوں کے خلاف نفرت کی آگ بھڑک رہی ہے؟ مگر اس وقت حالات اتنے برے نہیں تھے۔

''دراصل یہ ان کے اچھے اخلاق کا نتیجہ ہے۔ مگر یہ سادھو بابا اسلامی رسوم ورواج سے صحیح طور پر واقف نہیں ہیں اس لیے میں بھی ان کے ساتھ چلوں گا'' ایک نوجوان شخص نے کہا۔ پھر ایک جیپ کرایے پر لائی گئی مگر کسی کو یہ نہ معلوم ہوا کہ اس کے کرایے کے پیسے کس نے ادا کیے۔ کسی نے رازدارانہ طریقے سے یہ نیک عمل انجام دیا۔ جیپ ڈاکٹر صاحب کے گھر رات کو دس بجے پہنچی۔

رضوان اور رضا اس بلائے ناگہانی سے بے خبر تھے اور جھگڑا لڑائی میں مصروف تھے۔ مجیب گھر پر موجود نہیں تھا۔ مگر اس کو کسی نے اطلاع دی تھی کہ اس کے والد بیمار ہیں اس

لیے وہ گھر کے لیے روانہ ہو چکا تھا۔ جیسے ہی جیپ گاؤں پہنچی گاؤں کے تقریباً آدھے لوگ میت کو دیکھنے کے لیے دوڑ پڑے اور جیپ کو چاروں طرف سے گھیر لیا۔

مجیب جب رات کے گیارہ بجے گھر پہنچا تب اس کو حقیقت کا علم ہوا۔ یہ جانکاہ خبر سن کر وہ بچوں کی طرح رونے پیٹنے لگا۔ محلے والوں نے میت کو غسل دیا۔ اس کے بعد نمازِ جنازہ ادا کی گئی پھر سب کے محبوبِ نظر ڈاکٹر صاحب کو دفن کر دیا گیا۔ درحقیقت یہ ان کی تدفین نہیں تھی بلکہ بھلائی کا ایک باب تھا جو بند ہو گیا۔

ایک نسل تھی جو اپنے انجام کو پہنچ گئی۔

پرانی قدروں کا ایک دروازہ تھا جو اب بند ہو گیا۔

چند بوڑھے پرانے لوگ ان کی شان میں تعزیاتی کلمات ادا کرنے لگے ''انہوں نے تو بچپن میں کھیلتے ہوئے بھی کسی کو دھوکہ نہیں دیا''۔ ایک بوڑھا شخص جو دیوار کے سہارے ٹیک لگا کر بیٹھا تھا اس نے ڈاکٹر صاحب کے لیے دعائے مغفرت کی۔ ایک اور بزرگ نے کہا ''جب یہ بنگلہ دیش چلے گئے تھے تب ہم لوگوں کو بہت دُکھ ہوا تھا۔ پھر بھی ہم آس لگائے بیٹھے تھے ایک نہ ایک دن یہ ضرور واپس آئیں گے مگر اب.........'' اتنا کہتے ہی اس بزرگ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ پھر انہوں نے اپنا عصا اٹھایا اور آنسو پونچھتے ہوئے گھر چلے گئے۔

''دیکھتے ہیں ان کے بیٹے کیسے ان کی جانشینی ادا کرتے ہیں'' لوگوں نے سرگوشیاں شروع کر دیں۔

اگلے دن رضا اپنی بیوی کی مقررہ چیک اپ کرانے گیا۔ ڈاکٹر نے انہیں بتایا کہ مرض میں حیرت انگیز بہتری آئی ہے اور امکان ہے کہ اگلے مہینے تک رانی کو اسپتال آنے کی بھی ضرورت نہیں پڑے۔

یہ خبر سن کر رضا خوشی سے رقص کرنے لگا۔ رضا صرف اس لیے نہیں خوش تھا کہ رانی کو ایک جان لیوا مرض سے شفا مل گئی تھی بلکہ اس لیے بھی کہ اب اپنے سُسر اور ساس کو خوش خبری سنانے کے لیے رانی کے مائیکے جائے گا۔ وہ لوگ پہلے ہی سے جشن کے ماحول میں ڈوبے ہوئے تھے۔ کیوں کہ حامد کا برسوں کا سپنا پورا ہو چکا تھا۔ وہ اپنے وکیل کے ساتھ مل کر راشد کو پھانسنے اور جیل بھیجنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔

جب رضا اپنی بیوی بچے کے ہمراہ حامد کے گھر پہنچا اس وقت حامد گھر پر نہیں تھا۔ وہ راشد سے ملنے جیل گیا ہوا تھا۔ راشد جیل کی سلاخوں کے پیچھے ایسے بیٹھا ہوا تھا جیسے کوئی کھلاڑی شکست خوردہ ہو کر بیٹھتا ہے۔ حامد نے ہاتھ ہلا کر راشد سے پوچھا ''کیسے ہیں بھائی جان؟'' راشد جواب میں چند گالیوں کے علاوہ کچھ نہ کہہ سکا۔

حامد نے ہنستے ہوئے جواب دیا'' بھائی صاحب کھیل تو آپ نے شروع کیا تھا مگر ختم میں نے کیا۔ فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ آپ بہت جلد رہا ہو جائیں گے۔ اس کے بعد ہم دونوں سکون کی زندگی گزاریں گے'' حامد نے اس جنگ کے خاتمے کی پیشکش کی۔

''سکون؟ سکون سے تمہاری کیا مراد ہے؟ تم نے مجھے جیل بھیجوایا۔ اور پھر یہاں تماشا دیکھنے آگئے۔ اور اس کے بعد کہتے ہو کہ سکون کی زندگی گزاریں گے۔ کیا تم نے یہ سوچ رکھا ہے کہ میں تم کو چین سے جینے دوں گا؟ اگر تم نے ایسا سوچا ہے تو یا تو تم احمق ہو یا تم نے مجھے بیوقوف سمجھ رکھا ہے۔ تم یہاں میرا مذاق اڑانے آئے ہو۔ جب میں جیل سے باہر آؤں گا تو قیامت بپا کر دوں گا۔ تمہاری زندگی کو جہنم بنا کر رکھ دوں گا'' راشد جس طرز سے بکے جا رہا تھا اس سے حامد کو ابدی راحت و مسرت کا احساس ہو رہا تھا۔

راشد کی بیٹی کے نکاح کو بس پندرہ دن بچ گئے تھے۔ راشد جلد سے جلد جیل سے

باہر آنا چاہتا تھا۔

رانی اپنے ابا سے ملنے کا انتظار کر رہی تھی۔ حامد اب گھر لوٹ رہا تھا راستے میں اس کا گزر قبرستان سے ہوا۔ وہ اگر چہ خائف نہیں تھا تاہم وہ قرآن کی چند آیتیں پڑھ کر اپنے اوپر دم کرنے لگا۔ ''میں جیل سے رہا ہو کر اسی سڑک سے واپس آیا تھا۔ میں نے نہ کوئی غلطی کی تھی اور نہ کوئی قانون توڑا تھا۔ تو پھر اس نے مجھے کیوں پھانسا تھا؟ کیوں اس نے مجھے جیل بھیجا تھا؟ اب وہ خود اپنے کیے کی سزا بھگت رہا ہے۔''

راستے میں اس کی نگاہ ایک درخت پہ پڑی جس کی ایک شاخ زمین تک جھکی ہوئی تھی۔ وہ اس شاخ پر جا کر بیٹھ گیا۔ اور پھر شاخ کو ہلانے لگا۔ اس کو خود یہ معلوم نہیں تھا کہ وہ ایسی حرکت کیوں کر رہا ہے۔ اچانک اس کی آنکھوں میں آنسوؤں کے موتی چھلکنے لگے۔ یہ وہی شاخ تھی جس پر تینوں بھائی بچپن میں کھیلا کرتے تھے۔ اس وقت راشد حامد کو اپنی جان سے زیادہ چاہتا تھا۔ اس کی آنکھیں درخت کی جڑ میں کچھ تلاش کر رہی تھیں۔ ''یہیں تو میں نے وہ چھڑی چھپائی تھی۔

کیا وہ چھڑی پردۂ غیب میں چلی گئی؟'' وہ خود سے بڑبڑا رہا تھا۔ جب راشد اسکول سے بھاگ گیا تھا اور اس کے والد حاجی صاحب راشد کو پیٹنے کے لیے ڈھونڈ رہے تھے تب حامد نے راشد کو ابا کی مار سے بچانے کے لیے ان کی چھڑی اسی درخت کی تہہ میں چھپا دی تھی۔ حامد کو اب بھی یاد ہے کہ کیسے اس کے ابا اس چھڑی کو لے کر فکر مند ہو گئے تھے۔ آخر کار ان کو چھڑی نہیں ملی تھی اور وہ گھر چلے گئے تھے۔ اس واقعے کے تین دن بعد راشد اور حامد پھر اسی درخت تلے کھیلنے آئے تھے جہاں حامد نے اپنے بھائی راشد کو یہ راز کی بات بتائی تھی۔ اور پھر اس کے ایک مہینے بعد ان کے والد اس دنیا سے کوچ کر گئے تھے۔

حامد اپنے بچپن کی یادوں میں کھویا ہوا تھا تبھی کسی نے اس کو پکارا۔اس نے دیکھا وہ اس کا وکیل تھا۔

''یہاں کیا کر رہے ہو؟''

''کچھ نہیں''

''کیا عجیب اتفاق ہے! جیل جانے سے پہلے تمہارا بھائی بھی یہیں بیٹھا ہوا تھا۔ میں اس کو مسکراتا دیکھ کر دنگ رہ گیا تھا۔اس کے ہاتھوں میں ایک نہایت فرسودہ اور پرانی چھڑی تھی۔ وہ اس چھڑی کو دیکھ کر مسکراتا ہی جارہا تھا۔تب میں نے اس سے وہی سوال کیا تھا جو تم سے کر رہا ہوں۔اور اس نے بھی وہی جواب دیا تھا جو تم نے دیا۔''کچھ نہیں''۔ تم دونوں عادات واطوار میں ایک دوسرے سے خوب ملتے جلتے ہو۔وکیل نے کہا۔

حامد نے جواب میں کچھ نہیں کہا۔وکیل نے حامد کو اس کے گھر تک پہنچایا کیوں کہ رات بہت تاریک اور ڈراؤنی ہو چکی تھی۔

حامد کی بیوی خوشی سے پھولے نہیں سما رہی تھی کیوں کہ ایک ساتھ دو دو خوشیوں نے اس کے دروازے پر دستک دی تھی۔رانی شفایاب ہو چکی تھی۔اور اس کے سرتاج اپنی زندگی کے مشن میں کامیاب ہو چکے تھے۔اب وہ منصوبوں اور اسکیموں سے اس کو تنگ نہیں کریں گے۔راشد کو اپنی بیٹی کی شادی کی فکر ستا رہی تھی۔ وہ اب حامد سے انتقام لینے کی فکر میں ڈوب چکا تھا۔اس مرتبہ وہ حامد کے ساتھ عابد اور جاوید کو بھی پھنسانا چاہتا تھا کیوں کہ ایسا کر کے ہی اس کے جوشِ انتقام کو تسکین مل سکتی تھی۔اور مزید یہ کہ یہ حامد کے لیے ''اینٹ کا جواب پتھر سے'' کے مترادف ہوگا۔حامد گھر پہنچا جہاں ایک دوسری خوشی اپنی بانہیں پھیلائے اس کا انتظار کر رہی تھی۔

☆☆☆

پندرھواں باب

مشترکہ فیملی کے ساتھ رانی کی دس سالہ زندگی ہو یا فیملی سے علاحدہ ہو کر سالوں سال کی زندگی، رانی کو اپنی زندگی میں ہمیشہ پرخار وادیوں سے گزرنا پڑا۔ خوشی ہو یا غم وقت کا قافلہ تو گزر ہی جاتا ہے۔ اس سے کیا فرق پڑتا ہے کہ جب آپ ماضی کے دریچوں میں جھانک کر دیکھیں تو آپ کو یادوں کا ایک ہرا بھرا گلشن نظر آئے یا خوف و ہراس کا ایک عالم؟ ماضی تو ماضی ہی ہوتا ہے۔

ایک نہایت خوبرو اور وجیہہ لڑکا دلکش کپڑوں میں ملبوس ہو کر گھر محلے میں گھوما کرتا تھا۔ وہ بیس سال کا ہو چکا تھا اور اس کی والدہ رانی سنِ اَیاس کو پہنچ گئی تھی۔ رانی نے اپنے بیٹے کے لیے ایک سنہرا خواب بن رکھا تھا۔ رانی اس کو تعلیم حاصل کرنے کے لیے یونیورسیٹی بھیجنا چاہتی تھی۔ اس کی دیرینہ خواہش تھی کہ وہ اپنے بیٹے کو ایک پروفیسر کی شکل میں دیکھے۔ اور اس کی دو وجہیں تھیں۔ ایک یہ کہ پروفیسر کی عوام کی نگاہ میں بڑی عزت ہوتی ہے اور دوسری وجہ یہ کہ رانی چاہتی تھی کہ اس کا بیٹا غربت کے خلاف جنگ میں رانی کی مدد کرنے کے قابل ہو سکے۔ وہ اچھے دن کے انتظار میں اپنی زندگی کی تمام مصیبتیں برداشت کرتی رہی۔ اب نخلِ تمنّا کی شادابی کا دن بہت جلد آنے والا تھا۔ اس کا لاڈلا بیٹا اردو ادب میں بی۔ اے کی ڈگری حاصل کر چکا تھا اور اب رضا اپنے لاڈلے کی اعلیٰ تعلیم کی فیس جمع

کرنے کے لیے جان توڑ کوششیں کر رہا تھا۔

ایک مدت تک بیمار رہنے کی وجہ سے رانی کی صحت غیر ہوگئی تھی۔ وہ بہت نحیف ونا تواں لگتی تھی۔ رضا بھی زندگی کے نشیب وفراز کا سامنا کرتے کرتے وقت سے پہلے ہی بوڑھا ہوگیا تھا۔ اب رضا کے ذہن سے نکاحِ ثانی کا خیال بالکل نابود ہوگیا تھا۔

انس کے گھر سے تین کلومیٹر کے فاصلے پر ایک کالج تھا جہاں تعلیم حاصل کرنے وہ پیدل جایا کرتا تھا۔ مگر یونیورسٹی اس کے گھر سے انیس کلومیٹر کی دوری پر تھی اس لیے اب وہاں داخلہ کرانے کے بعد انس کو گھر سے دور رہنا پڑے گا۔ داخلہ کے بعد اس کو شہر میں کرایے کے کمرے میں رہنا پڑے گا جس کا لازمی نتیجہ اخراجات میں اضافہ ہے۔ رضا نے بار بار رانی کو یہ سمجھانے کی کوشش کی کہ انس کی اعلیٰ تعلیم کے اخراجات اس کی اوقات وآمدنی سے بالاتر ہیں مگر رانی ہر بار بضد رہی۔ رضا نے مشورہ دیا کہ اس بہتر ہے کہ ہم انس کو بمبئی یا دہلی کچھ کام دھندا کرنے کے لیے بھیج دیں تا کہ اس کی کمائی سے ہماری غربت وافلاس کی تاریکی چھٹ جائے۔ مگر رانی اپنے بیٹے کی تعلیم سے سمجھوتہ کرنے کے لیے کسی صورت تیار نہیں تھی۔

انس کے تعلیمی مسئلے کے حل کے لیے رضا نے ملازمت کی تنخواہ کے علاوہ اور پیسے اکٹھے کرنے کا فیصلہ کیا مگر ناکام رہا۔ رانی کو مرغیاں پالنے کا شوق تھا پھر اس نے رضا سے مشورہ کر کے اس مشغلہ کو پیشہ میں تبدیل کر دیا۔ انس چونکہ اعلیٰ تعلیم کے لیے شہر جانے والا تھا اس لیے انہوں نے انس والی کوٹھری میں ایک زبردست پولٹری فارم کا افتاح کر دیا۔

انس پہلی مرتبہ یونیورسٹی گیا تھا اس لیے وہاں کی رنگینیوں کو دیکھ کر دنگ رہ گیا۔ یونیورسٹی کی بڑی بڑی عمارتیں دیکھ کر وہ بہت متاثر ہوا۔ اس کی آنکھوں نے پہلی مرتبہ لڑکے اور لڑکیوں کو بانہوں میں بانہیں ڈال کر گھومتے ہوئے دیکھا۔ انس کو اردو لٹریچر ایم اے میں

داخلہ لینا تھا۔

چند خوبصورت اور دلکش شعبہائے تعلیم سے گزرتے ہوئے وہ بے رنگ اور گندی پرانی عمارتوں کے سلسلہ تک پہنچ گیا۔ یہی ڈپارٹمنٹ آف لینگویجیز اینڈ لٹریچر تھا۔ زبان وادب کے شعبے جتنے دھبے اور بے ترتیب تھے سائنسی شعبوں کے مناظر اتنی ہی دل آویز و دل فریب تھے۔ بہرحال انس شعبۂ اردو کے اندر داخل ہوا جہاں سب سے پہلے اس کی ملاقات چند آوارہ جانوروں اور چوہوں سے ہوئی۔ اس نے وہیں سے لوٹ جانے کا فیصلہ کیا مگر جیسے ہی وہ اندر داخل ہوا ایک نوجوان زہرہ جمال حسینہ کی مسحور کن آواز سن کر اس نے اپنا فیصلہ فوراً بدل دیا۔

''کیا تم یہاں داخلے کے لیے آئے ہو؟''

''ہاں'' چار پانچ پری زادیوں کے آگے کچھ بولنے کی جسارت کرنے کے لیے انس کی سٹی پٹی گم ہوگئی۔ لڑکیاں سمجھ گئیں کہ یہ لڑکا نیا ہے کیوں کہ اس کی آنکھیں مسلسل ان کے سراپا کا مطالعہ کرتی جا رہی تھیں۔

ان میں سے ایک لڑکی نے آگے بڑھ کر پوچھا ''تم داخلے کے لیے آئے ہو یا تمہارا داخلہ پہلے ہی ہو چکا ہے؟''

''آج میرا پہلا دن ہے اور میں صرف پوچھ تاچھ کرنے آیا ہوں''

''تم کیا پوچھنا چاہتے ہو؟ ہوسکتا ہے میں تمہاری کچھ مدد کرسکوں''

''دراصل میں داخلے کی کاروائی کے بارے میں جاننا چاہتا ہوں''

''اس سلسلے میں ہمارے پاس معلومات ہیں'' پھر تینوں لڑکیوں نے اس کے سامنے داخلے کی کاروائی کا خلاصہ پیش کیا۔ ایک لڑکی جس نے گلابی رنگ کا سوٹ زیب تن کر رکھا تھا وہ ان لڑکیوں کے پیچھے چپ چاپ کھڑی مسکرا رہی تھی۔ وہ بار بار اس

کو گھورے جا رہا تھا۔ دوسری لڑکیوں نے بھانپ لیا کہ وہ اس سے بات کرنا چاہتا ہے سو لڑکیاں اس کے سامنے سے ہٹ گئیں۔ اب انس کی نگاہوں کے سامنے ایک دبلی پتلی مگر خوبصورت اور نادان سی لڑکی کھڑی تھی۔ انس پہلی ہی نظر میں گھائلہ ہو گیا اور اب وہ اس سے بات کرنا چاہتا تھا۔

''کیا فارم بھرنے میں آپ میری مدد کر سکتی ہیں؟'' انس نے نرمی سے درخواست کی۔

''ہم سب یہاں تمہاری مدد کے لیے کھڑے ہیں تو پھر اس کے ہاتھوں میں کون سا جادو ہے کہ تم اسی سے اپنا فارم پر کروانا چاہتے ہو؟''

دوسری لڑکیوں نے شرارت سے پوچھا اور کھلکھلا کر ہنس پڑیں۔ انس بھی ہنستے ہنستے بول پڑا ''اے نہیں......کچھ خاص نہیں........آپ میں سے کوئی بھی میری مدد کر سکتی ہیں''

''خیر جو بھی ہو۔ ایسے لوگ مجھے حنا کہہ کر پکارتے ہیں'' یہ کہہ کر اس نے دوستی کا ہاتھ بڑھا دیا۔ انس نے بھی بلا چوں وچرا اس سے ہاتھ ملایا۔ پھر وہ اس وقت تک اس کو گھورتا رہا جب تک کہ اس نازک خرام نے دوبارہ اس کا نام نہیں پوچھ لیا۔

''اوہ ! ....سوری..........میں اپنا نام بتانا ہی بھول گیا........میں اسی طرح مجذوب ٹائپ کا انسان ہوں........''

''سوری کہنے کی کوئی ضرورت نہیں......اگر تم مجذوب اور بے خود ہو تو اس میں تعجب کی کیا بات ہے.......

اکثر اردو شعرا کا یہی حال تھا۔ بلکہ ہر مفکر مَستِ اَلَست اور بے خود سا نظر آتا ہے۔۔۔ کیا تم بھی شاعر ہو؟''

''نہیں تو۔۔۔ شاعری سے میرا دور دور تک کوئی واسطہ نہیں ۔ہاں میں افسانہ

نگار ہوں''

''بہت خوب ،تمہارے نزدیک اردو کا سب سے پسندیدہ افسانہ نگار کون ہے؟
یقیناً تم منٹو کو پسند کرتے ہو گے''

''نہیں تو''

''تو پھر بیدی ہوں گے؟''

''نہیں وہ بھی نہیں''

''تو پھر یقیناً تمارے پسندیدہ افسانہ نگار کرشن چندر ہوں گے؟''

''نہیں وہ بھی نہیں''

''تو پھر کون؟''

''میری پسندیدہ افسانہ نگار قرۃ العین حیدر صاحبہ ہیں''

''لیکن وہ تو شاعروں کی طرح بے خود نہیں تھیں؟''

''ہاں ۔نہیں تھیں ۔مگر انہوں نے 'شعور کی رو' کا خوب استعمال کیا ہے''

''اس بات سے مجھے اتفاق ہے''

''تم بے حد حسین ہو''

''ہاں ۔۔۔وہ تو میں ہوں ۔۔۔اور تم بہت دلچسپ ہو''

''جی ۔میں دلچسپ ہوں''

''چلتے ہیں ۔پھر ملیں گے''

''شاید اب کلاس میں ہی ملاقات ہو گی''

انس کی حنا سے پہلی ملاقات ایک یادگار ملاقات تھی ۔زندگی میں پہلی دفعہ اس نے کسی لڑکی سے اتنی لمبی گفتگو کی تھی ۔اس نے داخلہ فارم پُر کیا اور پھر داخلے کی دوسری

کارروائیوں کو ادا کر کے رہائش گاہ لوٹ آیا۔

عام طور پر انس اپنے پہناوٴ اوڑھاوٴ پر زیادہ دھیان نہیں دیتا تھا۔ لیکن آج انقلابی طور پر وہ بن سنور کے آئینے کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ بس اتنا ہی نہیں۔ وہ کچھ گنگنا بھی رہا تھا۔ پھر اس نے کتابوں کا بستہ اپنی پشت پر لٹکایا اور کالج کے لیے روانہ ہو گیا۔

آج اس مرحلۂ تعلیم کا پہلا دن تھا اس لیے کلاس طلبہ و طالبات سے پُر تھی۔ لڑکیاں پہلی صف میں بائیں جانب بیٹھی تھیں اور انس کو اسی صف میں داہنے جانب جگہ ملی تھی۔ پروفیسر قادری نے کلاس میں آتے ہی ترقی پسند تحریک کے متعلق چند سوالات کیے۔

''تم میں سے کتنے لوگ ترقی پسند تحریک سے آگاہ ہیں؟''

پروفیسر نے پوچھا۔

سب نے یہ سوچ کر فوراً ہاتھ اٹھا دیا کہ پروفیسر صاحب تھوڑی سب سے فرداً فرداً اس کا جواب پوچھیں گے بلکہ وہ کسی ایک سے پوچھ کر مطمئن ہو جائیں گے۔

''بہت خوب'' پروفیسر نے ان کی حوصلہ افزائی کی اور سب سے ترقی پسند تحریک کے موضوع پر ایک ایک صفحہ لکھنے کو کہا۔

''ترقی پسند تحریک کا کیا مطلب ہو سکتا ہے؟ لگتا ہے اس سے مراد وہ شعرا اور ادباء ہیں جنھوں نے خوب ترقی کی ہے۔ ہو سکتا ہے اس کا کوئی اور مطلب ہو'' انس تشویش میں تھا کیونکہ اس کو اب تک اس فقرہ کا لغوی معنی ہی معلوم تھا۔ وہ ترقی پسند تحریک کی اصل حقیقت سے اب تک یکسر بیگانہ تھا۔

''اردو کے کسی ادیب نے بہت زیادہ ترقی تو اب تک نہیں کی ہے میں کیا لکھوں؟ ان میں سے کوئی بھی اپنی زندگی میں شہرت یافتہ نہ ہوئے سب نے گوشۂ گمنامی میں زندگی گزاری'' ابھی انس نے لکھنا بھی شروع نہیں کیا تھا کہ دوسرے طلبہ نے اپنا اپنا کچا چھٹا جمع

کرنا شروع کر دیا۔ سب سے پہلے حنا نے جمع کیا۔ چارے ناچارے انس کو بھی جمع کرنا پڑا۔ اس کے پاس چھٹکارہ کی کوئی راہ نہ تھی۔ پھر پروفیسر نے اس طالب علم کا نام پکارا جس نے اس کے مطابق سب سے بہتر جواب لکھا تھا۔

''شارق کون ہے؟'' پروفیسر نے پوچھا۔ پچھلی صف سے ایک موٹا مسٹنڈا سا لڑکا کھڑا ہوا۔ پھر پروفیسر نے اس کی تعریف کی۔ ہر طالب علم پیچھے مڑکر شارق کو دیکھنے لگا۔

پھر دوسرا نام پروفیسر نے پکارا۔ حِنا کس کا نام ہے؟'' پروفیسر نے حنا کی بھی خوب تعریف کی اور پھر کارروائی جاری رکھی۔ انس سوچ رہا تھا کہ چار پانچ کاپیاں جانچنے کے بعد پروفیسر صاحب سب کی کاپیاں لوٹا دیں گے اور میں بچ جاؤں گا مگر پروفیسر نے ایک ایک کر کے سب کی کاپیاں جانچ کیں۔ جب انس کی کاپی پر پروفیسر کی نگاہ پڑی، اس کے چہرے کا جغرافیہ بدلنے لگا۔ اس نے ایک ایک جملہ احتیاط سے پڑھا۔ انس سوچ رہا تھا کہ اگر پروفیسر نے کوئی منفی تبصرہ کیا تو پھر پورے کلاس کے سامنے مجھے شرمندہ ہونا پڑے گا۔ میری کافی رسوائی ہوگی۔

''انس کون ہے؟''

انس کھڑا ہوا

''یہ کیا لکھا ہے تم نے؟ ذرا کلاس کے سامنے پڑھ کر سناؤ تا کہ تمہارے کلاس کے طلبہ تمہاری مراد اور مطلب سمجھ سکیں۔ تمہاری تحریر میری سمجھ سے بالاتر ہے'' پروفیسر قادری نے غصے سے کہا۔

انس چُپ چاپ مجسمۂ حیا بنا کھڑا رہا۔ پروفیسر قادری نے اس کی کاپی سے ایک دو سطر بلند آواز سے پڑھی اور تمام طلبہ نے قہقہہ لگایا۔ حنا بھی اس کی تحریر سن کر مسکرا اٹھی۔

ان کو اتنی شرمندگی محسوس ہوئی کہ وہ کسی کو کلاس کے بعد ہائے ہیلو بھی نہیں بول سکا۔ وہ کلاس سے نکل کر فوراً چلا گیا اور دوبارہ کالج نہ آنے کا فیصلہ کیا۔ جب وہ باہر جا رہا تھا تبھی اس کی نگاہ حنا پر پڑی جو اس کو دیکھ کر مسکرا رہی تھی۔ انس کو لگا کہ وہ بھی اس کا مذاق اڑا رہی ہے۔ وہ اس سے نظر بچا کیر بلڈنگ سے باہر چلا گیا۔ وہ واپس ہاسٹل آ گیا۔ پہلے پہل تو اس نے کالج چھوڑ دینے کا فیصلہ کیا لیکن پھر اس کو احساس ہوا کہ کالج چھوڑ دینے سے اس کی والدہ کا خواب شرمندۂ تعبیر نہیں ہو سکتا۔

ہاسٹل میں اس کا روم پاٹنر ظفر نام کا ایک لڑکا تھا۔ ظفر اردو ایم۔اے۔ کے سالِ آخر کا طالب علم تھا۔ اس نے انس کو کالج نہ چھوڑنے کا مشورہ دیا اور دلاسہ دلایا کہ وہ اس کی حتی المقدور مدد کرے گا۔ ظفر لائبریری سے کتابیں نکال کر انس کو دیتا۔ پھر اس کے بعد دونوں اس کتاب کے مشمولات پر بحث و مذاکرہ کرتے۔ ایک مہینے میں انس کا اعتماد بحال ہو گیا اور اس نے دوبارہ کالج جانے کا فیصلہ کیا۔

اس مرتبہ واقعہ یکسر الگ تھا۔ شارق اور حنا کی دوستی ہو چکی تھی۔ انہوں نے انس کے ساتھ ایسا برتاؤ کیا کہ گویا انس پڑھنے میں ان کے پایے کا نہیں ہے۔ شارق کی توجہ پڑھائی سے زیادہ حنا پر تھی۔ انس ایک مہینہ میں یہ دوسری بار کالج آیا تھا۔ آج پھر کلاس میں اس کا پالا پروفیسر قادری سے پڑا۔ آج اس نے طلبہ کو مرزا غالب کے چند اشعار کی تشریح و توضیح کرنے کے لیے دیے۔ آج حیرت انگیز طور پر انس کی تشریح سب سے اچھی تھی۔ آج جا کر انس کو لگا کہ وہ بھی دوسرے طلبہ کے مساوی ذہن کا مالک ہے۔ دوسرے طلبہ نے بھی اس کی قابلیت کا لوہا مان لیا۔ اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے اکثر طلبہ اس کے دوست بن گئے جن میں حنا، شارق اور صبا بھی شامل تھے۔

ایک دن اس کے کلاس کے تمام ساتھیوں نے ایک ساتھ تفریح کرنے کا فیصلہ کیا۔

چہل قدمی کے دوران وہ لوگ اردو ادب پر تبادلۂ خیالات کر رہے تھے۔ ان کی بحث کا موضوع تھا کہ اردو ادب کا سب سے عظیم شاعر کون ہے۔

''میرے خیال سے میر تقی میر اردو ادب کے سب سے عظیم شاعر تھے'' صبا نے بحث کا آغاز کیا۔

''نہیں۔ درحقیقت غالب کو میں سب سے عظیم شاعر و سخن ور تسلیم کرتا ہوں۔ میر کی شاعری میں ان کی اپنی زندگی کے تجربات و احساسات کے سوا کچھ بھی نہیں۔ غالب کو دیکھو۔ ان کی شاعری میں خیالات کی معراج اور ان کا کلام بصیرت سے لبریز ہے'' شارق نے چیلنج دیا اور اپنے نقطۂ نظر کی حمایت کے لیے انس کی طرف دیکھا۔

''لیکن شاعری کی بنیاد فلسفے اور بصیرت پر نہیں ہونی چاہیے۔ دراصل شاعری نام ہے صدائے دل کا۔ اچھی شاعری ہر کسی کے دل میں گھر کر جاتی ہے۔ شاعری میں رومانس نہ ہو تو بے کار ہے۔'' حنا نے صبا کی حمایت کی۔

انس کو حنا کے دل میں اپنی جگہ بنانے کے لیے اس سے اچھا موقع نہیں مل سکتا تھا۔

''بالکل صحیح کہا تم نے۔ شاعری ایک نازک شئے ہے۔ اس کا فلسفہ اور بصیرت سے کوئی تعلق نہیں۔ شاعری دلی احساسات و جذبات پر مشتمل ہونی چاہیے'' انس نے موقعے کا استعمال کیا اور حنا کی تائید کی۔

حنا کے لبوں پر مسکراہٹ چھا گئی اور انس کے جواب سے وہ خوش ہو گئی۔

یہ لوگ محوِ گفتگو تھے جبھی پروفیسر قادری کا ان کے پاس سے گزر ہوا۔ قادری صاحب نے ان کی باتیں سن کر مسکرا دیا۔

اب موسم کا مزاج بدلنے لگا۔ ہر طرف کالے بادل چھا گئے اور ہوائیں چلنے لگیں۔ بارش کا سماں بندھ گیا۔

''واہ کیا بات ہے۔ موسم کتنا سہانا ہو چلا ہے'' حنا آسمان کی طرف نظر اٹھاتے ہوئے بولی۔

''پھر تو ہم سب کو کچھ لمحے ایک ساتھ رہ کر موسم کا لطف اٹھانا چاہیے'' شارق نے کہا۔

''ٹھیک ہے۔ ہمیں قریب کے کسی ریستوران میں چلنا چاہیے''انس نے مشورتاً کہا۔

''یہ عمدہ خیال ہے۔ میرے ذہن میں بھی کچھ ایسا ہی چل رہا تھا'' حنا نے کہا اور انس کا چہرہ خوشی سے کِھل اٹھا۔

''میں نے ایک غزل لکھی ہے۔ جس کے چند اشعار میں تم لوگوں کو گا کر سناؤں گا۔ یہ اس رومانی فضا کے بالکل موافق ہوگا'' شارق نے کہا۔

پھر ان سب نے گیٹ کے سامنے والے ''کرشن ریستوراں'' نامی ہوٹل میں جانے کا فیصلہ کیا مگر اس سے پہلے کہ وہ وہاں پہنچتے جھما جھم بارش ہونے لگی۔ بشمول حنا کے سب کے کپڑے نم ہو گئے۔ کسی طرح بھیکتے بھاگتے وہ ریستوراں تک پہنچے۔ ریستوران بارش کی وجہ سے گاہکوں سے خالی پڑا تھا لہذا یہ لوگ آسانی سے اپنی اپنی جگہ لے کر بیٹھ گئے۔ حنا انس کے پہلو میں بیٹھی جسے دیکھ کر شارق جل بھن گیا۔

پھر شارق نے اپنی ڈائری کھولی۔

''اس حسین اور خوبصورت لمحہ کو اپنی فلسفیانہ غزل سے پراگندہ مت کرنا۔ کوئی رومانی غزل ہو تو سناؤ''۔

صبا نے کہا۔

''غالب کی طرح نہیں۔ سمجھے؟'' حنا اس کو تنگ کرنے کی نیت سے بولی۔

غالب بھی کبھی کبھی رومانی شاعری کرتے تھے۔کیا تم نے نہیں سنا ہے؟

دلِ ناداں تجھے ہوا کیا ہے
آخر اس درد کی دوا کیا ہے

شارق نے ایک بہترین عشقیہ غزل سنائی۔حنا متاثر ہو کر شارق اور اس کی شاعری کی تعریفیں کرنے لگیں اور انس اندر تک جل اٹھا۔

پھر محفل کے اختتام میں انہوں نے کچھ چائے وائے پی اور جدا ہونے سے قبل شارق نے ہر ایک کو اپنی برتھ ڈے پارٹی میں مدعو کیا۔یہ پارٹی اتوار کو شارق کے گھر پر منعقد ہونے والی تھی۔

☆☆☆

سولہواں باب

رانی کے سر کے بال سفید ہو گئے۔ لمبے انتظار اور لمبی بیماری کی وجہ سے اس کے چہرے پر جھریاں آ گئیں۔ مشترکہ فیملی سے الگ ہو کر اس کی زندگی میں شانتی تو آ گئی مگر ہمیشہ اس کو تنہائی کا احساس رہا۔ بالخصوص جب سے انس تعلیم کی غرض سے شہر چلا گیا تب سے تنہائی اس کا مقدر بن گئی۔ گرچہ اس کے گاؤں سے شہر کا فاصلہ کچھ زیادہ نہیں تھا پھر بھی بذریعۂ بس شہر تک پہنچنے میں دو گھنٹے لگ جاتے تھے۔

آج نہ جانے کیوں اپنے معمول کے خلاف انس بے حد خوش تھا۔ وہ چولہے کے قریب اپنی والدہ کے پہلو میں بیٹھا ہوا تھا۔ اس کی والدہ رانی روزانہ صبح سویرے اٹھ کر گھر آنگن کی صفائی کرتی پھر ناشتہ اور کھانا پکا کر اپنے خاوند کے اسکول سے لوٹنے کا انتظار کرتی۔ انس جب سے شہر گیا تھا اس دن سے رانی کی زندگی کا یہی معمول بن چکا تھا۔

''تمہاری پڑھائی کیسی چل رہی ہے؟''

''ایک دم زبردست چل رہی ہے۔ امی!''

''ابھی میں ایم اے پڑھ رہا ہوں۔ اس کی تعلیم مکمل ہونے کے بعد میرا اندراج پی

ایچ ڈی میں ہو جائے گا اور ساتھ ہی ساتھ مجھے پروفیسر بنانے کا آپ کا خواب بھی پورا ہو جائے گا۔

’’یہ محض ایک خواب نہیں ہے میرے بچے! یہ ایک مشن ہے جسے تم پورا کرو گے۔ میں تعلیم سے کوری رہی۔ تمہارے دونوں ماماں بھی انگوٹھا چھاپ ہیں۔ تمہارے نانا جان تعلیم کی اہمیت سے بخوبی واقف نہیں تھے لیکن میں تمہیں حتی المقدور تعلیم دینا چاہتی ہوں۔ ایک بات بتاؤ۔ تمہارے کلاس میں اور طلبہ بھی ہوں گے جو پروفیسر بنا چاہتے ہوں گے۔ ان کے ارادوں کے بارے میں کچھ بتاؤ‘‘

’’ہاں امی! میرے بہت سارے دوست ہیں۔ لیکن شارق حیرت انگیز صلاحیت کا مالک ہے۔ مجھے لگتا ہے وہ مجھ سے پہلے ہی پروفیسر بن جائے گا۔ اور ایک حنا نام کی لڑکی ہے۔ وہ جتنی باصلاحیت ہے اتنی ہی حسین بھی ہے۔ آئندہ اتوار کو شارق کا برتھ ڈے ہے۔ حنا بھی اس پارٹی میں آ رہی ہے۔ میں سوچ رہا ہوں کون سا کپڑا زیب تن کر کے پارٹی میں جاؤں‘‘ اتنا کہہ کر انس اٹھا اور خوشی سے رقص کرتا ہوا اپنے کمرے میں چلا گیا۔

ماں تو ماں ہوتی ہے۔ رانی انس کے حالِ دل سے واقف ہو گئی۔ وہ انس کی کہی اور ان کہی ساری باتیں سمجھ گئیں۔

ٹیکنالوجی کی دنیا میں روز بروز ترقی ہو رہی تھی جس کا فائدہ لوگوں کی ذاتی زندگی میں ظاہر ہونے لگا تھا۔ ہر گاؤں محلہ بجلی کی روشنی سے جھمجھا رہا تھا۔ حکومت کی جانب سے بازاروں اور پوسٹ آفسوں کو فون کی سہولت دے دی گئی تھی۔ کچھ مالداروں اور صاحبِ حیثیت لوگوں کے گھروں میں بھی فون دستیاب تھا۔

رانی کی زندگی میں اب خوشیاں لوٹ آئی تھیں۔ اب اس کا اکلوتا بیٹا ترقی کی راہ پر گامزن تھا۔ اس کا شوہر ایک سرکاری اسکول کا ٹیچر تو تھا ہی ساتھ ہی ساتھ اس نے اپنے

پرانے تجربے کے مطابق لوگوں کا علاج ومعالجہ بھی کرنا شروع کر دیا تھا۔ اگر چہ میڈیکل کی ڈگری حاصل کیے بغیر لوگوں کا علاج کرنا غیر قانونی تھا مگر اس کی پرواہ کس کو تھی؟ جس کی دوائی سے شفا حاصل ہو جائے وہی ان لوگوں کا مسیحا ہوا کرتا تھا۔

ایک دن اچانک رانی کھانسنے لگی۔ رانی ڈاکٹر سے ملنا چاہتی تھی مگر رضا نے اس سے کہا کہ فکر کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ گاؤں کے تمام لوگ اسی سے دوائی دارو لیا کرتے تھے اس لیے رضا اپنی بیوی کو بھی اپنی ہی دوائی کھلانا چاہتا تھا۔

''ڈاکٹر سے مل لینا بہتر رہے گا'' رانی نے کہا۔

''ڈاکٹر کیا دے گا؟ وہی ساری دوائیاں تجویز کرے گا جو میں تم کو دے رہا ہوں۔ اس پر الگ سے وہ غیر ضروری ڈھیر ساری مہنگی جانچ کرانے کا مشورہ دے گا''۔

''آپ پڑھے لکھے ہیں۔ میں تو ایک ان پڑھ عورت ہوں۔ آپ کو جو مناسب لگے وہی کریں''

رضا نے کچھ سوچا اور پھر ڈاکٹر کے یہاں لے جانے کے لیے رانی کو تیار ہونے کا حکم دیا۔ وہ لوگ ڈاکٹر کے یہاں گئے۔ ڈاکٹر نے تھوڑی تشویش ظاہر کی اور چند طرح کی جانچ کرانے کا مشورہ دیا۔

میں نے کہا تھا نا تم سے کہ آجکل کے ڈاکٹر صرف جانچ والوں سے کمیشن کا مال کھانے کے چکر میں غیر ضروری جانچ لکھ دیتے ہیں۔ میں اس ڈاکٹر کے پھندے میں نہیں پھنسنے والا۔ تم کو محض بخار اور کھانسی ہے جس کا علاج میں اچھی طرح جانتا ہوں۔ بخار کے لیے تمہیں چند گولیاں کھانی ہوں گی اور کھانسی کے لیے ایک بوتل سیرپ پینا ہوگی اور بس'' رضا یہ کہہ کر گھر کے لیے روانہ ہو گیا۔

حامد اس کی بیوی اور راشد بہت پہلے ہی اپنی اپنی نوکری سے ریٹائرڈ اور بوڑھے ہو چکے تھے۔ اب لڑائی جھگڑے کا جنون بھی ان کے سر سے اتر گیا تھا۔ حامد اپنے بھائی راشد کو دو دن کے لیے جیل بھیجنے میں کامیاب ہو گیا۔ اب ان دونوں کی لڑائی کی آگ ٹھنڈی ہو گئی تھی۔ حامد اپنے بیٹوں کو تعلیم کے زیور سے آراستہ نہ کر سکا۔ جب اس کے رشتے دار اس کے بیٹوں کی تعلیمی لیاقت کے بارے میں پوچھتے تو حامد کا سر احساس ندامت سے جھک جاتا۔ اب جا کر حامد کو تعلیم کی اہمیت کا اندازہ ہوا۔ کیوں کہ اس کے رشتہ داروں میں کئی افراد اعلیٰ تعلیم یافتہ تھے اور قابلِ احترام عہدوں پر فائز تھے۔

اس ضعیفی میں حامد اپنے بچوں کی تعلیم کے بارے میں کیا سوچتا؟ اب وہ اپنی صحت کا ہی خیال کر لے وہی بہت ہے۔ عابد کے بھی دو بیٹے اور تین بیٹیاں تھیں۔ عابد چونکہ تعلیم کی اہمیت سے روشناس ہو چکا تھا اس لیے اپنے بچوں کو پڑھانے لکھانے میں وہ ہر ممکن کوشش کر رہا تھا۔ اب لڑکیوں کی شادی کرانا آسان نہیں تھا۔ معاشرے میں اب تعلیمی بیداری پیدا ہو چکی تھی اور ہر کوئی پڑھی لکھی لڑکی تلاش کرتا تھا۔ بلکہ بعض لوگ تو لڑکی کے والد کی تعلیمی لیاقت بھی دیکھ کر شادی بیاہ کے لیے رشتہ طے کرتے تھے۔

عابد بڑی مشکل سے کھیتی باڑی کر کے کچھ پیسے کماتا تھا۔ جاوید نے کئی طرح کی تجارتوں میں قسمت آزمائی کی لیکن ان پڑھ ہونے کی وجہ سے سب ناکام رہیں۔ اس کی کوئی نوکری تو نہیں تھی لیکن اب وہ اپنے ابا حامد کی موت کا انتظار کر رہا تھا تاکہ کچھ زمین وغیرہ بیچ کر کوئی کام دھندہ کر سکے۔ ان تمام مشکلات کے باوجود وہ اپنے بچوں کو تعلیم دینے کے لیے کوشاں تھا۔

سترہواں باب

حنا گھر جا کر شارق کی برتھ ڈے پارٹی میں جانے کا منصوبہ بنانے لگی۔ حنا کو اندیشہ تھا کہ ہونہ ہوانس اس کی محبت میں گرفتار ہو جائے مگر وہ تو شارق سے پیار کرتی تھی اور شارق بھی اس کو جان سے زیادہ چاہتا تھا۔ اسی کش مکش کے عالم میں اتوار کا دن بھی آ گیا۔

آخر کار شارق کے تمام دوست واحباب اس کے گھر پر اس کے یومِ ولادت کا جشن منانے کے لیے آئے۔ حنا کافی بن سنور کے آئی تھی اور اپنے حُسن کی رعنائیاں بکھیر رہی تھیں۔ شارق بھی اس دن کم نہیں تھا۔ اس نے شیروانی پہن رکھی تھی اور بہت اسمارٹ لگ رہا تھا۔ شارق کی فیملی میں اس کے علاوہ صرف اس کی والدہ تھیں۔ اس کے ابا سعودیہ عربیہ میں کسی ٹریویل کمپنی میں کام کرتے تھے اور کبھی کبھی گھر آتے تھے۔ شارق کی والدہ ضعیف ہو چکی تھیں۔ ان کے خوبصورت حسین چہرے پر بڑھاپے کی وجہ سے سلوٹیں آ چکی تھیں مگر لباس کے معاملے میں وہ اب بھی محتاط تھیں۔ جب انس نے آ کر ان کو 'ہیلو' کہا تو انہوں نے جواب میں صرف مسکرا دیا۔ کیونکہ وہ پرانی قدروں کی پرستار تھیں۔ جب حنا نے ''ہیلو'' کہا تب بھی جواب میں فقط مسکرا پڑیں۔

حنا بھی پرانے لوگ اور پرانے خیالات کے بارے میں خوب جانتی تھی اس لیے وہ کمرے کے اندر گئی اور شارق کی والدہ کے پہلو میں بیٹھ گئی۔ شارق کی والدہ نے اس کے چہرے کو اپنے دونوں ہاتھوں میں لے کر اس کی پیشانی پر بوسہ دیا اور بولی ”کتنا حسین چہرہ ہے! بالکل چاند کی طرح!“

”آنٹی جی میں آپ سے کچھ پوچھنا چاہتی ہوں“ حنا نے بڑی شائستگی سے دریافت کیا۔

”بولو بیٹی! کیا بات ہے؟“

”جب آپ کا دل کچھ اور کہے اور دماغ کچھ اور تو آپ کس کی سنیں گی اور کس کو ٹھکرا دیں گی؟“

حنا نے سوال کیا۔ اس سے پہلے کہ شارق کی والدہ کچھ بولتیں شارق ایک مشہورِ روزگار اردو شعر پڑھتے ہوئے کمرے میں داخل ہوا ۔

بے خطر کود پڑا آتشِ نمرود میں عشق
عقل ہے محوِ تماشائے لبِ بام ابھی

شعر سن کر دونوں کے لبوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ پھر شارق نے اپنے والدین کی داستانِ عشق کی مختصر جھلکیاں پیش کیں جسے سن کر حنا اس کی والدہ سے بے حد متاثر ہوئی۔ انس نے پردے کی اوٹ سے سب کچھ دیکھ لیا اور سن لیا۔ پھر سب گھر کے آنگن میں گئے جہاں شارق نے کیک کٹائی کی رسم ادا کی۔ پھر شارق نے ایک ٹکڑا حنا کو دیا جس ٹکڑے کو حنا نے اپنے ہاتھوں سے اس کی والدہ کو کھلایا۔ یہ سب کچھ تالیوں کی گڑگڑاہٹ اور گونج میں ہوا۔ اس کے بعد شارق نے اپنی ایک خوبصورت اور بہترین غزل گا کر سب کا دل جیت لیا۔ پھر سب لوگ لنچ کے لیے گئے جہاں انس کی آنکھیں نہایت اضطراب کے

عالم میں حنا کو تلاش کر رہی تھیں۔ مگر حنا وہاں نہیں تھی۔ انس نے کسی سے پوچھنا مناسب نہیں سمجھا کیونکہ وہ اس راز سے پردہ اٹھانا نہیں چاہتا تھا کہ اس کے دل میں انس کے لیے کچھ چل رہا ہے۔ انس اپنی پلیٹ اٹھا کر حنا کی جستجو میں ادھر ادھر گھومنے لگا تبھی اچانک اس کی نگاہ نے دیکھا کہ حنا کمرے کے اندر شارق کی والدہ کے ساتھ کھانا کھا رہی ہے۔

کچھ لمحے میں پارٹی اختتام کو پہنچ گئی۔ اب ہر کوئی جانے کی تیاری میں تھا۔ حنا جب شارق کی والدہ سے رخصت کی اجازت لینے گئی تو اس کی والدہ نے نم آنکھوں سے اس کو الوداع کہا۔

گھر واپس ہوتے وقت انس حنا کی یادوں میں کھو گیا۔ وہ یہ سوچ رہا تھا کہ حنا کتنی ملنسار ہے؟ وہ خوبصورت سی لڑکی اچھے اخلاق کی پیکر اور تہذیب وتمدن کی جیتی جاگتی مجسمہ ہے۔ انس کے دل میں اس کے عشق کا جذبہ اور بھی گہرا ہو گیا۔ شارق بہت خوش تھا۔ کیوں کہ اس کے گمان میں اس نے پارٹی کے ذریعے سب کو خوش کر دیا تھا۔

انس نے گھر پہنچ کر اپنی والدہ کو پارٹی کی پوری روداد سنائی۔ اس مرتبہ ان کی والدہ رانی بھی سنجیدہ تھی۔ وہ حنا کے متعلق خوب سوالات کرتی رہی اور انس نے اپنی والدہ کو حنا کی پوری کنڈلی بتا دی۔ جب رانی نے انس سے اس کی خواہش دریافت کی کہ آیا وہ حنا سے شادی کرنا چاہتا ہے یا نہیں؟ انس اپنی والدہ کے سوال سے تصویر حیرت بن گیا۔ پہلے پہل تو اس کو جواب میں کچھ نہیں سوجھا لیکن پھر ہمت کر کے اس نے "ہاں" کہہ دیا۔

اس کے بعد انس اس سانحہ کو بھلا کر اپنے دوسرے ساتھیوں کی طرح امتحان کی تیاری میں مصروف ہو گیا۔ لیکن تب تک حنا کے دل کی دنیا بھی بدل چکی تھی۔ حنا انس کو اپنا جیون ساتھی منتخب کرنے کا فیصلہ کر چکی تھی مگر اس کی حیا مانع اظہار تھی۔ لیکن وہ اپنی امی سے بہت بے تکلف اور فرینک تھی اس لیے اس نے اپنی والدہ کو اپنے احساسات وجذبات

سے باخبر کردیا۔

ٹھیک امتحان سے چندروز قبل رضا کا ایک دوست جو کہ حنا کے والد کا بھی دوست تھا حنا کی سگائی کا پیغام لے کر رضا کے پاس آیا۔ رضا نے امتحان کے اختتام تک اس پیشکش کو ٹال دیا۔

امتحان سے فارغ ہو کر شارق قدرے اداس رہنے لگا تھا۔ کیوں کہ وہ اس بات سے آگاہ ہو چکا تھا کہ حنا انس کی محبت میں گرفتار ہو چکی ہے۔ مگر وہ اپنی اداسی دوسروں سے چھپانا چاہتا تھا۔ جو کہ تقریباً ناممکن ہے۔ کیونکہ محبت اور نفرت کے جذبے کبھی پوشیدہ نہیں رہتے۔ محبت اونفرت کی مثال تو اس خوشبو یا دھوئیں جیسی ہے جو خود بخود ادراک کے افق پر پھیل جاتے ہیں۔ رفتہ رفتہ شارق کے تمام احباب کو اس کی اداسی کا راز پتہ چل گیا۔ پھر امتحان کے اختتام کے بعد لڑکے اعلیٰ تعلیم کے لیے اچھی یونیورسٹی کی تلاش میں لگ گئے اور لڑکیاں گھر میں بیٹھ کر اپنی اپنی شادی کے دن گننے لگیں۔

انس نے اپنی تعلیم کے لیے دہلی یونیورسٹی کا انتخاب کیا۔ اس کا داخلہ ایم۔ فل۔ میں ہو گیا۔ اس کی والدہ اپنے جگر کے ٹکڑے کو اپنی آنکھوں سے دور نہیں بھیجنا چاہتی تھی مگر وہ تعلیم کی اہمیت جانتی تھی اس لیے کسی طرح دل پر پتھر رکھ کر اس کو اجازت دینی پڑی۔

دوسری لڑکیوں کی طرح حنا بھی اپنے گھر پر ہی تھی اور بس اب شادی کا انتظار تھا۔ انس اپنی تعلیم میں مصروف تھا ادھر اس کے ابا نے اس کی سگائی کی تاریخ متعین کر دی۔

جب انس گھر لوٹا وہ اس بات سے مکمل بے خبر تھا کہ اس کی سگائی اور منگنی ہونے والی ہے۔ حیرت سے اس کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں جب اس نے دیکھا کہ اس کے ابا کے ہمراہ اس کے کچھ رشتے دار بھی اس کو اسٹیشن لینے کے لیے آئے ہوئے ہیں۔ وہ اپنی جگہ

تصویر حیرت بنا کھڑا رہا۔ پھر اس کو خوشخبری سنائی گئی اور اس کا دل خوشی سے جھوم اٹھا۔ دم زدن میں اس نے پتہ لگا لیا کہ ضرور اس میں اس کی والدہ کا کلیدی کردار رہا ہوگا۔

اس کی والدہ کی کھانسی بد سے بدتر ہوتی جا رہی تھی۔ اب جا کر رضا کو احساس ہوا کہ یہ کوئی معمولی کھانسی نہیں ہے اور ڈاکٹر کے مشورے کے مطابق اس کی اچھی طرح چیک اپ کرانی چاہیے۔

☆☆☆

اٹھارہواں باب

راشد اور حامد اگر چہ باہمی لڑائی جھگڑے سے تھک ہار کے صلح پسند ہو چکے تھے لیکن اب بھی دونوں خاندانوں کے بیچ ایک سرد جنگ جاری تھی۔

ایک دن جب کہ راشد کے تمام بیٹے دعوت ولیمہ میں شرکت کرنے کے لیے گاؤں سے باہر گئے ہوئے تھے تبھی دفعتاً راشد کو اپنے سینے میں ایک کرارا درد محسوس ہوا اور وہ اپنے کمرے میں جا کر سو گیا۔ کسے خبر تھی کہ وہ اب ابدی نیند سو رہا ہے؟

حامد ہی پہلا شخص تھا جس کو سب سے پہلے راشد کے انتقال کی جانکاہ خبر ملی۔ بھائی کی موت کے غم میں مہینوں تک حامد کی آنکھیں برستی رہیں۔ اب سماج کو پتہ چلا کہ ہزار ہا عداوت ومخاصمت کے باوجود دونوں بھائیوں کے درمیان بے پناہ محبت تھی۔ اس کی وفات دراصل ایک صدی کا خاتمہ تھی۔

راشد کے گزر جانے کے بعد دنیا کی نگاہوں نے دیکھا کہ اتحاد کیا چیز ہوتی ہے۔ حامد اور راشد کی فیملی باہم محبت واخوت کی زنجیر میں بندھ گئی اور سماج میں ان کے اتحاد کی مثالیں دی جانے لگیں۔ مگر یہ امن وشانتی کا زمانہ دیرپا ثابت نہیں ہوا اور دونوں کے بیٹوں نے ورثے میں ملی لڑائی کو پھر سے ہوا دے دی۔ جب رانی کو اپنے چچا کی خبر ملی وہ افسوس میں اس دن کھانا نہیں بنا سکی اور کچھ دنوں تک لقمہ اس کی حلق سے نیچے نہیں اترا۔ راشد کے

مرتے ہی اس کے بیٹے وراثت کے لیے ایسے لڑنے لگے جیسے کتے ہڈی کے ایک ٹکڑے کے لیے لڑتے ہیں۔ راشد کی ایک بیٹی بھی تھی جو سالوں پہلے اللہ کو پیاری ہو چکی تھی۔ لیکن اس کے بھی دو بیٹے تھے جو بٹوارے میں حصہ چاہتے تھے۔ مگر کسی نے ان کو پٹی پڑھا دی تھی کہ اگر والد کی حیات میں اس کا بیٹا یا بیٹی انتقال کر جائے تو ایسی صورت میں فوت شدہ بیٹے یا بیٹی کی اولاد کو نانا یا دادا کی وراثت میں کوئی حصہ نہیں ملے گا۔ پھر بھی یہ لوگ آسانی سے ہار ماننے کو تیار نہیں تھے۔ انہوں نے ایک ایک وکیل سے مشورہ کیا جس نے انہیں بتایا کہ ہندوستانی آئین کے مطابق ان کو راشد کی وراثت میں حصہ ملے گا۔ یہ محض افواہ ہے کہ انہیں وراثت کا حق نہیں۔

لیکن اس افواہ کی بھی ایک بنیاد تھی۔ وہ یہ کہ اسلامی شریعت کی رو سے ان کو حقِ وراثت حاصلہ نہیں تھا۔ اس وقت مسلم پرسنل لاء کو حکومتِ ہند سے منظوری نہیں ملی تھی اس لیے ابھی یہ لوگ بھی وراثت کا دعویٰ کر سکتے ہیں۔

حامد کے گھر کا ماحول بھی کچھ الگ نہیں تھا۔ اس کے بیٹے بھی باہم برسرِ پیکار ہو گئے۔ مگر رانی کا حال ان سب سے جدا تھا۔ وہ تو پہلے ہی کمزور اور ضعیف ہو گیا تھا۔ آخر میں رضا اس کو ضلع کے اسپتال میں لے گیا جہاں ڈاکٹر اس کی بیماری کی صحیح پڑتال نہ کر سکا اور ڈاکٹر نے اس کو کالا جار بخار کی دوائی دے دی جس سے رانی کی حالت اور غیر ہو گئی۔ شہر کے ڈاکٹروں کا رجحان یہ تھا کہ وہ کم سے کم جانچ لکھیں تا کہ مریض ان کے یہاں سے بھاگ نہ جائیں۔ کیوں کہ جانچ میں پیسے کی خطیر رقم خرچ ہوتی تھی اور لوگ اکثر جاہل تھے اس لیے جو حال ڈاکٹر کا وہی حال مریض کا تھا اور دونوں جانچ سے دامن بچاتے تھے۔

لیکن رانی کی حالت بے حد خراب تھی۔ کھانستے وقت اس کو پیٹ میں درد محسوس

ہوتا تھااور ڈاکٹر کی تجویز کردہ دوائی کھالینے کے بعد تو دماغ اول بول ہونے لگتا تھا اور گہرا درد محسوس ہوتا تھا۔ رضا نے خیال کیا کہ ہوسکتا ہے رانی کا وزن کم ہے اس لیے دوائی کھانے سے یہ پریشانی ہورہی ہے۔ یہ دوائیاں ایک ڈاکٹر کی لکھی ہوئی ہیں اس لیے نقصان دہ ہونے کا امکان بہت کم ہے۔ پھر بھی اگر اس کی حالت ایسی ہی رہی تو پھر ڈاکٹر سے ملنا ہوگا۔ رانی کی جانب سے مسلسل شکایتوں کے بعد رضا نے رانی کو ڈاکٹر کے یہاں لے جانے کا فیصلہ کیا لیکن پھر اس نے اس خیال کو انس کی شادی تک ملتوی کر دیا۔

حنا اپنی شادی کے بارے میں سوچ سوچ کر خوشی سے پاگل ہورہی تھی۔ اس کی شادی اس شخص سے ہونے جارہی تھی جس کو وہ بہت قریب سے جانتی ہے۔ آئینے کے سامنے بیٹھتی اور خود سے شرما جاتی۔ اس کو احساس تھا کہ اس نے شارق کا دل توڑا ہے مگر یہ اس کو اپنی خطا اور اپنا قصور تصور نہیں کرتی تھی کیوں کہ وہ جانتی تھی کہ اس میں اس کی جانب سے کوئی غلطی نہیں ہوئی ہے۔ شارق بھی اس کے حال سے واقف تھا مگر خود اس نے کبھی کوئی گلا نہیں کیا۔

حنا کی تمام سہیلیاں اس سے جلتی تھیں اس لیے جب ان کو پتہ چلا کہ حنا کی شادی شارق کے بجائے انس سے ہورہی ہے تو انہوں نے اس کی شادی میں نہ آنے کا فیصلہ کیا بلکہ اس کی شادی کا بائیکاٹ کر دیا۔ ان سب کے باوجود انس نے شارق سے خط و کتابت کی مگر کوشش کے باوجود اس سے ملاقات نہ ہوسکی۔ امتحان کے بعد وہ شہر چھوڑ کر ایک سال کے لیے گاؤں اپنی فیملی کے پاس چلا گیا تھا۔

انیسواں باب

انس اور حنا کی شادی کے سلسلے میں سب سے پہلے جانبین اور طرفین نے روبرو بیٹھ کر مشورہ کیا اور نکاح کی کوئی مبارک و مسعود تاریخ متعین کرنے کے لیے مولوی صاحب کو بلوایا۔ مولوی صاحب آئے اور جنتری دیکھ کر دو چند مناسب تاریخیں بتا کر چلے گئے۔ ایک گھنٹے تک کافی گہرائی اور گیرائی سے غور و فکر کرنے کے بعد فریقین چودہ فروری کی تاریخ پر متفق ہو گئے۔ اس کے بعد لڑکی کے والد نے حاضرین کے درمیان لڈو تقسیم کی۔

دونوں طرف شادی کی تیاریاں شباب پر تھیں۔ پھر وہ لوگ باورچیوں سے قول وقرار کرنے بازار گئے مگر ویلن ٹائن ڈے (یوم محبت جو چودہ فروری کو منایا جاتا ہے) کی وجہ سے ان میں سے اکثر اس تاریخ کو خالی نہیں تھے۔ رضا نے ایک پرانے دوست سے بات کر لی جو کسی زمانے میں طباخ ہوا کرتا تھا۔ اس کے بعد رضا اپنے چھوٹے بھائی رضوان کے ساتھ دعوت نامہ کا آرڈر دینے کے لیے پرنٹنگ پریس کی دکان گیا۔ دو سے تین گھنٹے ضائع کرنے کے بعد ان کو ایک کارڈ کی تزئین پسند آئی۔ کارڈ کا آرڈر دینے کے بعد وہ لوگ دیگر اشیا کی خریداری کے لیے پنساری اور قصائی کی دکان پر بھی گئے۔ ان کو شہر میں ابھی بھی ڈھیر سارے کام انجام دینے تھے مثلاً بارات کے لیے گاڑیاں بک کرنی تھیں اور دولہے کی گاڑی سجانے کے لیے بھی کسی نہ کسی سے قول وقرار کرنا ضروری تھا۔ بہر حال ایک ہفتے کی

ان تھک کوشش سے ساری تیاریاں پایۂ تکمیل تک پہنچ گئیں۔

اڑوس پڑوس کی عورتیں رانی کے گھر آتیں اور رانی کے ساتھ مل جل کر شادی بیاہ کی گیت گاتیں۔ رانی نے ایک خط لکھ کر اپنے والدین کو اس پربہار موقع پر شرکت کی دعوت دی۔ رسم کے مطابق دولہے کو کام کرنے کی اجازت نہ تھی اور نہ ہی نکاح سے پہلے سات روز تک گاؤں کے حدود سے باہر جانے کی آزادی تھی۔ انس چونکہ اپنے والدین کا اکلوتا بیٹا تھا اس لیے اس کی مدد کے بغیر شادی کا انتظام وانصرام اس کے والد کے لیے نہایت دشوار ثابت ہو رہا تھا۔ پھر بھی کسی طرح اپنے ہمسایوں کی مدد سے اس نے تیاری مکمل کر لی۔

جب گاؤں سماج میں شادی بیاہ ہوتی ہے تو صاحبِ خانہ کے رشتے داروں اور بھائیوں کو بڑی امیدیں ہوتی ہیں کہ وہ ان کی خوب خاطر تواضع اور خوشامد کریں گے۔ اور اگر من مطابق ان کی آؤ بھگت نہیں ہوئی تو پھر انجام برا ہوتا ہے اور وہ لوگ شادی میں شرکت نہیں کرتے۔ ایسا ہی کچھ رضا کے ساتھ بھی ہوا۔ اس کے دونوں بھائیوں نے شادی میں شرکت نہ کرنے کا مزاج بنا لیا۔ رضا بھی اس سلسلے میں قدرے متفکر ہوا۔

گاؤں کا ہی باشندہ فضلو نام کا ایک شخص آیا اور رضا سے بات چیت کرنے لگا۔

فضلو: مجھے تو یہ فکر لگی ہے کہ اگر مہمانوں نے تم سے پوچھ لیا کہ تمہارے بھائی تمہارے بیٹے کی شادی میں کیوں شریک نہیں ہیں تو تم کیا جواب دو گے؟

رضا: میں ان سے کہہ دوں گا کہ وہ مجھ سے خوش نہیں ہیں۔

فضلو: اس سے مہمانوں پر تمہارے متعلق برا اثر قائم ہوگا۔ وہ یہ کہیں گے کہ تم ایک بھلے انسان نہیں ہو جبھی تو خود اپنے بھائیوں نے کنارہ کشی اختیار کر رکھی ہے۔

رضا: تو پھر بتائیں میں کیا کروں؟

فضلو: تم کو اپنے بھائیوں کے پاس جا کر ان کو منالینا چاہیے۔

رضا: آپ کی بات بالکل صحیح ہے۔لیکن میرے خیال سے وہ نہیں ماننے والے۔

فضلو: کسی طرح تم کو انہیں منانا ہی ہوگا۔

رضا: آپ کہہ رہے ہیں تو میں کوشش کروں گا مگر مجھے نہیں لگتا کہ وہ راضی ہوں

گے۔

فضلو: اب کب کوشش کرو گے؟

رضا: کسی اور دن۔

فضلو: ابھی کیا حرج ہے؟

رضا: ابھی وہ گھر پر نہیں ہوں گے۔

فضلو: وہ گھر پر ہیں۔

رضا: آپ کو کیسے پتہ؟

فضلو: میں نے آج ہی ان کو گھر پر دیکھا ہے۔

رضا: تو پھر چلتے ہیں۔

پھر دونوں جانے کے ارادے سے کھڑے ہوئے۔رانی پسِ دیوار ان کی باتیں سن چکی تھیں۔ وہ گھونگٹ سے اپنا چہرہ چھپا کر ان کے پاس آئی اور کہنے لگی ''خالی ہاتھ نہ جائیں۔اگر جانا ہے تو دعوت نامہ اور لڈو لے کر جائیں۔'' رضا کو رانی کا مشورہ ٹھیک لگا۔ اس لیے وہ دعوت نامہ اور مٹھائی کے ساتھ مجیب کے گھر گیا۔مجیب کمرے کے اندر نماز پڑھ رہا تھا۔اس کے نوکر نے آ کر دروازہ کھولا اور ان کو کرسی دے کر بیٹھنے کی گزارش کی۔

''یہ کون ہے؟'' فضلو نے نوکر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے رضا سے پوچھا۔''وہ اسکول کا چپراسی ہے لیکن مجیب بھائی کے گھر میں رہ کر ان کی خدمت کرتا ہے۔''

''کیسے ہو فضلو؟'' مجیب نے پوچھا۔

''بھائی صاحب۔ اللہ کا کرم ہے۔ اپنا سنایئے۔ آپ کو معلوم ہے کہ آپ کے بھتیجے کی شادی ہو رہی ہے'' فضلو نے کہا۔

''ہاں' گاؤں سماج کی زبانی سنا ہے۔ مگر اب تک کسی نے دعوت ہی نہیں دی''۔ مجیب نے طنز آمیز لہجے میں جواب دیا۔

''میں تو دعوت دینے ہی آیا ہوں'' رضا نے کہا اور دعوت نامہ اور مٹھائی پیش کرنے لگا مگر مجیب نے ہاتھ کے اشارے سے منع کر دیا۔

''رشتہ کرتے وقت میری ضرورت نہیں محسوس ہوئی اور نہ دن تاریخ متعین کرنے میں مجھے مدعو کیا گیا اور اب جبکہ سب کچھ فائنل ہو چکا ہے تم مجھے دعوت دینے آئے ہو۔ کس عقل سے تم نے سوچ لیا کہ میں تمہاری دعوت قبول کروں گا'' مجیب نے بڑی کراری آواز میں ان کو جھڑک دیا اس لیے یہ دونوں الٹے قدم واپس آ گئے۔

مجیب نے اسکول کے دیگر اساتذہ کو بھی اس شادی میں شرکت کرنے سے منع کر دیا۔

رانی بستر پر لیٹ کر اپنی زندگی کے مختلف اتار چڑھاؤ کے بارے میں سوچنے میں مصروف تھی۔ ایک وہ زمانہ تھا جب اس کو من مطابق کھانا بھی نہیں ملتا تھا۔ کتنی دشواریاں تھیں؟ کتنے مصائب و آلام تھے جن کا مقابلہ رانی نے کیا تھا۔ رانی زندگی کی تمام پریشانیوں کو صرف اچھے دن کے انتظار میں جھیل گئی تھیں۔ اس کو یقین کامل تھا کہ جب اس کا بیٹا پڑھ لکھ کر بڑا آدمی بن جائے گا تب اس کی تمام پریشانیاں دور ہو جائیں گی۔ اس کی زندگی میں بہار آ جائے گی۔ اور سب سے زیادہ خوشی اس کو اس بات کی تھی کہ جن مشکل مراحل سے اسے گزرنا پڑا ہے اس کا بیٹا ان سے محفوظ و مامون رہے گا۔ وقت برق رفتاری سے

گزر رہا تھا۔ آخرکار اس کے نکاح کی گھڑی آ ہی گئی۔ اب بہت جلد اس کا لاڈلا نکاح کرلے گا۔ اس کا بیٹا پورے گاؤں میں سب سے زیادہ پڑھا لکھا تھا۔ اس لیے اب اس کے سپنوں کو ساکار ہونے میں وقت نہیں لگے گا۔ رانی خود اپنی شادی کے بارے میں جب بھی سوچتی اس کی آنکھیں برس پڑتیں۔ رانی نے مدتوں خوشحالی کا انتظار کیا تھا۔ اس کی عمر ڈھلتی ہی جا رہی تھی جس کی وجہ سے روزمرہ کے کام کاج اس کے لیے دشوار ہوتے جا رہے تھے۔ لیکن وہ یہ سوچ کر صبر کر لیتی تھی کہ عنقریب اس کا بیٹا ایک چاند سی دلہن لے کر آئے گا جو گھر کے کاموں میں رانی کا ہاتھ بٹائے گی۔ پھر تو اس کو آرام ہی آرام ہو گا۔ رانی خیالات کی دنیا میں گم ہو چکی تھی۔

''گھر میں کاموں کا انبار لگا ہوا ہے اور تم یہاں آرام فرما رہی ہو؟ تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟'' رضا کمرے میں داخل ہوا اور رانی کے خیالات کی زنجیر ٹوٹ گئی۔ رضا اچھی طرح واقف تھا کہ جب بھی رانی اموشنل ہوتی ہے اس کو نیند نہیں آتی۔

''جی میں ٹھیک ہوں۔ کیا ہوا؟ انہوں نے کیا جواب دیا؟'' رانی نے آنسو چھپاتے ہوئے پوچھا۔

''انہوں نے شادی میں شرکت کرنے سے انکار کر دیا''۔

''مجھے معلوم تھا کہ وہ یہی کہیں گے''۔ رانی اتنا کہہ کر کھانسنے لگی۔

رضا نے ایک گلاس پانی لا کر پلایا اور پھر اس کو چارپائی پر لٹا دیا۔

''پتہ نہیں یہ بے رحم کھانسی کب تک تلوار بن کر میرے سر پر منڈلاتی رہے گی۔ لگتا ہے یہ مجھے قبر تک پہنچا کے ہی دم لے گی''۔

رانی نے پردرد لہجے میں کہا۔

''ایسی منحوس باتیں مت کرو۔ تمہیں تو ابھی اپنے بیٹے کی شادی دیکھنی ہے اس کی

کامیابیوں کا جشن منانا ہے اور ابھی تو وہ دن بھی آنا باقی ہے جب تم اپنے پوتے پوتیوں کے ساتھ کھیلو گے''

رضا نے دلاسہ دیا۔

''کیا پتہ خدا کو کیا منظور ہے؟ مگر میں اپنے پوتے پوتیوں کے ساتھ کھیلنے کے لیے بیتاب ہوں۔ میں آپ کو ایک بہت ہی دلچسپ بات بتانا چاہتی ہوں''۔ رانی نے کہا۔

''کون سی بات؟'' رضا نے تجسس سے پوچھا۔

''میرے پاس اب تک انس کا وہ پینٹ اور شرٹ ہے جو اس نے ایک سال کی عمر میں پہنا تھا۔ میں نے ان کو بحفاظت رکھا ہے''

''اچھا! مذاق تو نہیں کر رہی ہو؟ یہ کیسے ممکن ہو سکتا ہے؟'' یہ سن کر حیرت میں پڑ گیا۔

''میں ابھی دکھاتی ہوں'' رانی یہ کہہ کر ایک صندوق سے بچے کا کپڑا نکال لائی۔ یہ گلابی رنگ کا کپڑا تھا۔ رضا نے پہچان لیا۔ ''یہ وہی کپڑا ہے جو میں نے انس کے لیے اس کی پہلی سالگرہ پر لایا تھا'' رانی رضا کے پہلو میں کھڑی ہو کر ناز و ادا سے رضا کو تکے جا رہی تھی اس اظہار میں کہ اس نے رضا کے مطابق ایک ناممکن کو ممکن کر دکھایا ہے۔

''یہ میں انس کے پہلے بچے کو پہناؤں گی'' رانی خوش ہو کر بولی اور پھر کپڑے کو اسی صندوق میں چھپانے چلی گئی۔

شادی ہو گئی مگر رضا کے اسکول سے ادنیٰ یا اعلیٰ کسی اسٹاف نے شرکت نہیں کی۔ انس کے بہت سارے دوست اس کی شادی میں شریک ہوئے مگر کالج کا کوئی دوست نہیں آیا۔ انس اور حنا کے کچھ دوست ایسے بھی تھے جن کی شرکت یقینی تھی مگر وہ بھی نظر نہیں آئے۔ اب جا کر انس کی آنکھ کھلی کہ جن کو اس نے اپنا حقیقی دوست سمجھا تھا وہ اس کی کامیابی اور کامیاب لو میرج سے جل رہے تھے۔ انس کو اب سمجھ میں آیا کہ وہ لوگ اس کے دوست نہیں تھے بلکہ

دوست بننے کا دکھاوا کر رہے تھے۔

نکاح خوانی کی مجلس تمام ہوئی اور بارات کے ہمراہ دلہن دولہے کے ساتھ اس کے گھر آ گئی۔ رانی دروازے پر کھڑی تھی۔ اپنے بیٹے اور بہو کو دیکھ کر اس کی آنکھوں میں خوشیوں کے آنسو آ گئے۔ رانی کی بہن لیلیٰ بھی اس پُر بہار موقع پر اس کی خوشیوں میں حصہ لینے کے لیے حاضر تھی۔ رانی کی ہندو سہیلیاں اور پڑوسن دلہن کا سواگت کرنے کے لیے وہاں تیار تھیں۔ ہندو سہیلیوں کے ہاتھوں میں بڑا سا طشت تھا جس میں دیپ جل رہا تھا۔ اس کے علاوہ سندور اور کچھ مذہبی چیزیں بھی تھیں۔

وہ عورتیں رواج کے مطابق ایک چٹکی سندور دلہن کی پیشانی پر لگا کر اس کا خیر مقدم کرنے کے لیے داخلی دروازے پر کھڑی تھیں۔ اس رسم کی ادائیگی کے بعد دلہن حجلۂ عروسی میں داخل ہوئی اور پھر آگے کی کاروائی پوری کی گئی۔

جب دلہن گھر آئی، رانی کا دل خوشی سے رقص کرنے لگا۔ رانی انس کو تنہائی میں لے گئی اور اپنی ملکیت کی سب سے محبوب اور قیمتی چیز اپنی بہو کے لیے تحفے میں پیش کی۔ یہ سونے کی چوڑیاں تھیں۔

جب رانی حجلۂ عروسی میں داخل ہوئی تو پہلی مرتبہ حنا کے حسن کا جلوہ دیکھ کر اس کی آنکھیں خیرہ ہو گئیں۔ حنا اس کی توقع سے زیادہ حسین تھی۔ ساس بہو کی پہلی ملاقات تھی اس لیے رسم کے مطابق رانی کو کچھ نہ کچھ تحفے میں پیش کرنا ضروری تھا۔ سو رانی نے اپنی بہو کو سونے کی انگوٹھی پہنا کر اس رسم کی ادائیگی کی۔

شادی کے بعد انس اپنی اہلیہ کے ساتھ دہلی چلا گیا۔ رانی اور رضا کے دوست واحباب سب اپنے اپنے گھر لوٹ گئے اور پھر زندگی اپنے معمول پر آ گئی۔ جب رضا اسکول گیا تو اسکول کے چند اساتذہ نے تنہائی میں صفائی پیش کی اور کہا کہ وہ شادی میں شرکت

نہیں کر سکے کیوں کہ مجیب نے ان کو شریک ہونے سے منع کیا تھا۔

رانی گزشتہ کی طرح اب بھی جھاڑو برتن کرتی رہی۔ پڑوس کی چند عورتوں نے رانی سے کہا کہ وہ اکیلی ہے اور اکیلی ہی رہے گی کیوں کہ اس کا لاڈلا اکلوتا بیٹا اس کی اکلوتی بہو کو لے کر دہلی جا چکا ہے۔ نئے زمانے کے بہو بیٹے کو گھر کی فکر نہیں ہوتی۔

رانی نے کسی طرح پڑوسن کو سمجھایا کہ بیٹا ضرورت کے تحت بہو کو اپنے ساتھ لے گیا ہے۔ ایک نہ ایک دن تو پھر گھر ہی لوٹ کر آنا ہے۔

☆☆☆

بیسواں باب

اب انس ملازمت کی تلاش میں سرگرداں تھا۔ چونکہ اس کی پوری تعلیم اردو زبان وادب سے متعلق تھی اس لیے اس کو کوئی نوکری نہیں ملی۔ اس وقت ہندستان میں اکثر و بیشتر نوکری علاقائی زبان سے وابستہ تھی۔ اور ایسا وقت آن پڑا تھا کہ بغیر انگریزی سیکھے نوکری کا خواب دیکھنا بھی بے جا تھا۔ بہر حال انس نے جان توڑ کوششیں کیں اور پھر انگریزی زبان دانی کی بنیاد پر اس کو ایک کال سینٹر میں نوکری مل گئی جہاں اس کو رات میں ڈیوٹی دینی پڑتی تھی۔ کام دشوار تھا مگر پھر بھی وہ خوش تھا کیوں کہ اب وہ بے روزگار نہیں تھا۔ انس کے والدین ہر سال اس سے ملنے آیا کرتے تھے۔ زندگی اچھی خاصی کٹ رہی تھی۔ کبھی کبھی انس اور حنا کے درمیان تھوڑی سی ان بن بھی ہو جاتی تھی جو ان دونوں کی تہذیب کا لازمی حصہ تھا۔ انس ہمیشہ پیسے کمانے کے درپے رہتا تھا اور حنا اس سے سمجھوتہ کرنے کے لیے تیار نہیں تھی۔ تاہم حنا کو مسئلہ سلجھانے کا ملکہ حاصل تھا اس لیے جب کبھی انس غصے سے ناک بھوں چڑھاتا تو حنا اس کو سمجھاتی کہ وہ ایک غریب فیملی کے پروردہ ہیں لیکن نئی نسل ان کی طرح نہیں ہے۔ کال سینٹر کی نوکری انس کے لیے بے حد دشوار ثابت ہو رہی تھی۔ اس کو جنوبی دہلی سے گڑ گاؤں کا چکر لگانا پڑتا تھا۔ اگرچہ دہلی سے گڑ گاؤں جانے کے لیے کمپنی نے کیب مہیا کر دیا تھا لیکن سفر تو سفر ہوتا ہے۔ دن رات کا اکثر حصہ

سفر اور جاب میں گزر جاتا تھا اس لیے خالی اوقات میں وہ سونے کے علاوہ کچھ اور کرنے سے قاصر تھا۔ ہندستان میں رات کی نوکری اب بھی غیر معروف تھی۔ گاؤں کے لوگوں کی نگاہ میں یہ غریبی سے لڑنے کے مترادف تھا۔

''یہ میری زندگی بھر کے انتظار کا نتیجہ نہیں ہے۔ اعلیٰ تعلیم یافتہ ہونے کے بعد اس طرح کا کام میرے بیٹے کو زیب نہیں دیتا'' رانی انس کو کمرے میں داخل ہوتے دیکھ کر بولی۔ انس کو گمان نہیں تھا کہ اتنی صبح اس کی ماں جگ رہی ہوگی۔ صبح کے ساڑھے تین بج رہے تھے۔ انس کا موڈ اکھڑا اکھڑا سا تھا کیونکہ آج کمپنی میں باس کے ساتھ اس کی بحث ہوئی تھی۔

''امی آپ اب تک بیدار ہیں؟'' انس نے جواب دیا۔

''یہ کیسی آفت والی نوکری کر رہے ہو؟ یہ دن دیکھنے کے لیے میں زندہ نہیں ہوں۔ تم نے آئینے میں اپنی شکل دیکھی ہے؟ آنکھیں کیسی لال ہوئی جا رہی ہیں۔ مجھے اس دن کا انتظار نہیں تھا۔''

''امی! اچھے دن آئیں گے اور ضرور آئیں گے۔ مگر اس ظالم دنیا سے نپٹنے کے لیے وقتی طور پر یہ سب کرنا پڑتا ہے'' انس نے جواب دیا۔

''ہاں، اچھے دن تو آئیں گے۔ انہیں اچھے دن کے انتظار میں تمہارے ابا اور میں نے کتنے جتن کیے ہیں تم اس کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔ تمہارے پروفیسر بننے کا خواب کیا ہوا؟''

رانی نے دریافتِ حال کیا۔

''یہاں ہزاروں کی تعداد میں لوگ مجھ سے بڑی بڑی ڈگریاں لے کر بیٹھے ہوئے ہیں۔ پہلے ان کو موقع ملے گا اور جب میں پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کرلوں گا تب میں بھی

کسی یونیورسٹی میں اپلائی کروں گا۔ ابھی فی الحال کچھ وقت لگے گا۔ زیادہ نہیں بس اور چھ مہینے" انس کی بات پوری ہونے سے پہلے ہی رانی بول پڑی "پھر تم پروفیسر ہو جاؤ گے نا؟"

"نہیں امی تب میں اس طرح کی نوکری کے لیے اپلائی کرنے کا اہل ہو جاؤں گا۔ اور ایک نہ ایک دن میں پروفیسر بنوں گا اور پھر آپ کا خواب ادھورا نہیں رہے گا" انس اپنی امی کو یقین دہانی کراتے ہوئے بولا۔

"تب تک تو میں مرکھپ جاؤں گی" رانی ناامیدی سے بولی اور یہ ظاہر کرنے کے لیے کہ وہ سو رہی ہے کمبل کے نیچے چھپ گئی۔

"آپ کی زندگی اب شروع ہوئی ہے امی!" انس یہ کہہ کر اپنے کمرے میں داخل ہو گیا جہاں حنا اس کے انتظار میں بیٹھی ہوئی تھی۔

رانی کو نیند نہیں آرہی تھی۔ وہ رضا سے بات کرنا چاہتی تھی مگر وہ گہری نیند میں تھا۔ یہ لوگ گاؤں سے انس اور اس کی فیملی سے ملاقات کرنے آئے تھے۔ عید منانے کے بعد رانی رضا کے ساتھ واپس اپنی دنیا لوٹ جانے والی تھی۔ ان کو دہلی آئے ہوئے دس دن سے زیادہ ہو چکے تھے اور رضا کی ملازمت اس کو دس دن سے زیادہ کہیں ٹھہرنے کی اجازت نہیں دیتی تھی اس لیے دہلی سے لوٹ کر جانا ان کی مجبوری تھی۔ تقریباً ایک گھنٹہ بعد جب رضا فجر کی نماز کے لیے بیدار ہوا تو اس کے کانوں میں رانی کی سسکیوں کی آواز آئی۔ اس نے قریب جا کر رونے کی وجہ دریافت کی۔

"کل ہم لوگ پھر اسی تنہائی کی دنیا میں چلے جائیں گے۔ یہاں انس جب صبح نوکری سے آتا ہے تو اس سے دو باتیں کر کے دل بہلا لیتی ہوں۔

لیکن کل سے ہم دونوں ماں بیٹے میں جدائی ہو جائے گی" رانی روتے ہوئے بولی۔

"تمہارا رونا حق ہے۔ لیکن ہم انس کو اپنے ساتھ نہیں لے جا سکتے۔ وہ اب بچہ نہیں

رہا۔اس کی بھی اپنی فیملی ہے۔بات سمجھنے کی کوشش کرو' رضانے اس کو تسلی دینے کی کوشش کی۔

''ایک ماں کی نگاہ میں اس کا بیٹا خواہ کتنا ہی بڑا ہو جائے وہ بچہ ہی رہتا ہے'' اس نے جواب دیا۔

انس اپنی والدہ کے رونے کی آواز سن کر اپنے کمرے سے باہر آیا۔

''کیا ہوا ان کو؟ ''اس نے اپنے ابا سے پوچھا۔

''کچھ نہیں۔بس طبیعت تھوڑی ٹھیک نہیں ہے'' رضانے جواب دیا۔رانی پھر کھانسنے لگی۔اب کی بار کھانسی کچھ عجیب طرح کی تھی۔

''میرے خیال سے کسی اچھے ڈاکٹر سے ان کی جانچ کرانی چاہیے''

انس نے کہا۔

''میں نے ایک ڈاکٹر سے دکھایا ہے۔مجھے لگتا ہے کہ وہ اصل مرض کا پتہ نہیں لگا سکا ہے اس لیے اس کی دوا کھانے کے بعد رانی کی حالت اور خراب ہو گئی ہے'' رضانے اطلاع دی۔

انس کی مالی حالت بھی ٹھیک نہیں تھی اس لیے وہ اپنی والدہ کا علاج دہلی میں نہیں کرا سکا۔اس نے اپنے ابا کو مشورہ دیا کہ اسی ڈاکٹر کے پاس جا کر شکایت کریں کہ ''آپ کی دوائی کا کوئی مثبت اثر نظر نہیں آ رہا ہے''۔اور اگر مزید جانچ کرانے کی ضرورت پڑتی ہے تو کرا لیجئے گا۔اس سلسلے میں میں بھی کچھ پیسے بھیجنے کی کوشش کروں گا۔

''یہ بہتر خیال ہے'' رضانے جواب دیا۔

اگلی صبح بدھ کا دن تھا۔انس کی چھٹی کا دن اور اس کے والدین آج گاؤں کے لیے روانہ ہونے والے تھے۔حنا انس کو اپنے والدین کے لیے بے حد فکرمند ہوتے دیکھ کر بہت

زیادہ خوش نہیں تھی۔ وہ چاہتی تھی کہ اس کی توجہ زیادہ اپنی فیملی کے معاملات پر ہو۔انس قدرے اداس تھا۔ کیونکہ اس کے والدین جدا ہو رہے تھے۔ کمپنی کے اصول کے مطابق اس کو ایک ہفتے سے زیادہ کی چھٹی نہیں مل سکتی تھی اس لیے وہ مستقبل قریب میں مادرِ وطن نہیں جا سکتا تھا۔ گاؤں جانے میں تقریباً بیس گھنٹے لگ جاتے تھے۔ ٹرین کے ذریعے دو دن جانے میں اور دو دن لوٹنے میں۔ ان سب پر مستزاد یہ کہ اس کی بیوی نئی دہلی جیسے غیر مانوس شہر میں تنہا نہیں رہ سکتی تھی۔ وہ اس لیے بھی غمگین تھا کیوں کہ اس کو معلوم تھا کہ آئندہ عید تک نہ وہ گھر جا سکے گا اور نہ اس کے والدین دہلی آ سکیں گے۔ انس اپنے والدین کو وداع کر کے گھر لوٹ آیا۔ لوٹتے وقت وہ سوچ رہا تھا کہ پھر کل سے وہ زندگی کے اسی ٹریک پر ہو گا۔ وہی کام کی غیر مناسب مدت۔۔۔۔۔۔۔ وہی کھڑوس باس کی بیزار کن تقریر۔۔

وہ اس بے رونق زندگی سے چھٹکارا حاصل کرنا چاہتا تھا مگر اس کے علاوہ اس کے پاس دوسری کوئی راہ نہ تھی۔

☆☆☆

اکیسواں باب

اب انس پرانی دلی ریلوے اسٹیشن سے واپس آ رہا تھا۔والدین کی جدائی سے اس کا دل بہت اداس اور رنجور تھا۔اس کو اس بات کا کوئی اندازہ بھی نہیں تھا کہ اب دوبارہ کب والدین کی زیارت ہوگی۔اس نے دل ہی دل میں قدرت سے سوال کیا کہ ''کیوں اس نے انس کی فیملی کے ساتھ اس طرح کی ناانصافی کی ہے۔اس کی والدہ کو اپاہج بنایا۔اس کے والد کی تقدیر میں تنگدستی اور غربت لکھ دی اور خود اس کو ایسی غلامی کی نوکری دی جہاں زندگی جہنم بن کر رہ گئی ہے''۔

جب وہ پوسٹ آفس سے گزر رہا تھا تبھی اچانک اس کے ذہن میں خیال آیا کہ شارق کے بڑے بھائی تو یہیں کہیں رہا کرتے تھے۔''مجھے اس کے بھائی سے مل کر شارق کے حالات معلوم کرنے چاہیے'' یہی سوچ کر وہ بھیٹر بھاڑ والی گلی میں داخل ہوا جہاں وہ اپنی یادداشت کے مطابق ایک بڑے سے ٹوٹے پھوٹے لکڑی کے دروازے سے اندر داخل ہوا۔اندر جا کر اس نے دیکھا کہ دو کمرے ہیں اور دونوں مقفل ہیں۔اس نے ہمسایوں اور پڑوسیوں سے پتہ لگانے کی کوشش کی مگر کسی نے شارق کے بھائی کی کوئی خبر نہیں دی۔وہ

تھوڑا غمگین ہوا۔ پھراس کوشارق کی والدہ کی یاد آئی۔ ’’کتنی قدامت پسند عورت تھی وہ!
کیا پتہ آجکل وہ کہاں اور کس حال میں ہوگی؟ خدانے اس اہلِ جہاں پر بڑا احسان کیا ہے
کہ اس نے ماں جیسی خوبصورت مخلوق پیدا کی ہے۔ ماں کا رشتہ
کتنا پیارا ہوتا ہے۔ اور شاید یہ وہ واحد رشتہ ہے جو سب سے اہم اور نہایت خالص ہوتا ہے۔
کتنی ویران ہوتی ہوں گی ان کی زندگی جن کے سر سے ماں کی ممتا کا آنچل اُٹھ چکا
ہوتا ہے؟‘‘ اس کے ذہن میں یہی اَنٹ شنٹ خیالات گردش کررہے تھے تبھی دفعتاً اس کی
نگاہ ایک بوڑھی بھکارن پر پڑی جو ایک فرسودہ اور غبار آلود پرانی ساڑی پہنی ہوئی تھی
اور پیچھے سے وہ ٹھیک شارق کی والدہ لگ رہی تھی۔

انس کچھ دان خیرات کے ارادے سے اس بوڑھی عورت کے قریب گیا اوراس کے
دریوزہ میں بھیک کے چند سکے ڈال دیے۔ اس ضعیفی کے عالم میں بھی وہ عورت انس سے
پردہ کررہی تھی۔ وہ سکہ لے کر مسکرائی اور دعا دینے لگی ’’خدا تیری حفاظت کرے میرے
بچے! اور تیری زندگی کو خوشیوں سے بھردے!‘‘ انس کو یہ آواز جانی پہچانی معلوم ہوئی۔ اب
وہ اس عورت کا چہرہ دیکھنا چاہتا تھا۔ لیکن نہ جانے کیوں وہ بوڑھی عورت اس سے اپنا چہرہ
چھپارہی تھی۔ اس بھکارن کے اس رویّے سے انس اچنبھے میں پڑ گیا اور اب تو وہ اس ضعیفہ
کا چہرہ دیکھنے کے لیے بضد تھا۔ اس نے خوب کوشش کی مگر وہ عورت اپنا راز چھپانے میں
کامیاب ہوگئی۔ انس وہاں سے ہٹ گیا اور دور سے چھپ کر اس عورت کا چہرہ دیکھنے کی
کوشش کی۔ اس کا چہرہ دیکھ کر وہ دریائے حیرت میں ڈوبتا ہی چلا گیا۔ وہ تو بالکل شارق کی
ماں جیسی تھی۔

’’وہ یہاں کیسے ہوسکتی ہیں؟ وہ تو ایک نفاست پسند اور سنجیدہ عورت تھیں۔ ان کا اس
غلیظ جگہ پر پھٹی پُرانی ساڑی اور ٹوٹی پھوٹی چپلیں پہن کر بھیک مانگنا ممکن ہی نہیں۔ ضرور یہ

کوئی دوسری عورت ہے جس کی شکل وشباہت ان سے ملتی جلتی ہے'' وہ یہ سوچ کر دوبارہ اس عورت کے سامنے آیا مگراس مرتبہ اس کو اپنے دیکھے ہوئے پر یقین تھا۔ وہ اس کو پہچان گیا۔ وہ شارق ہی کی والدہ تھی۔ ''وہ یہاں کیا کررہی ہیں؟ ان کی یہ حالت کیسے ہوئی؟ وہ دہلی کیوں کر آئی اور بھیک اور گداگری کی نوبت کیسے آئی'' یہ سارے سوالات اچانک پاگل ہاتھی کی طرح اس کے ذہن ودماغ میں دوڑنے لگے۔ وہ فوراً اپنے سوالوں کا جواب چاہتا تھا۔ حیرت سے اس کا دماغ پھٹا جارہا تھا۔ اب وہ اس ضعیفہ کے بالکل قریب ہوگیا۔ وہ پھراس سے اپنا چہرہ چھپانے لگی۔

''آپ چھپنے کی کوشش کیوں کررہی ہیں؟ میں پہلے ہی آپ کو پہچان چکا ہوں۔ آپ کو بھیک مانگنے کی حاجت کیسے پڑی؟ اور شارق کہاں ہے؟'' انس نے ایک ہی سانس میں سب کچھ پوچھ لیا۔

''کتنی آسانی سے تم نے یہ سب پوچھ ڈالا مگران کا جواب دیتے ہوئے کلیجہ منہ کو آتا ہے۔ یا خدا! کیوں تو نے اس آدمی پر میری شکستہ حالت کا راز فاش کردیا؟ میں تیرے ہاتھ جوڑتی ہوں۔ اللہ کے واسطے میری آشفتگی کا مذاق مت اڑا'' اتنا کہہ کر اس بوڑھی عورت کی آنکھیں نم ہوگئیں اور آنسو کے قطرات اس کے چہرے کی جھریوں میں پھیل گئے۔

انس اس ضعیفہ کے آنسو اپنی آستین سے جذب کرتے ہوئے بولا ''میں یہاں آپ کو تکلیف دینے نہیں آیا۔ میں تو بس یہ جاننے کے لیے بے تاب ہوں کہ کس چیز نے آپ کو گداگری پر مجبور کیا۔ اور شارق کہاں ہے''؟

شارق تو بیٹا جیل کی سلاخوں کے پیچھے ہے۔ ایک دن ناہنجار پولیس والوں کی ایک جماعت جیپ میں سوار ہوکر میرے گھر آئی۔ بیٹا! وہ جمعہ کا دن تھا۔ شارق کی زندگی کا سب

سے سیاہ دن۔ ان میں دو پولیس والے بغیر اجازت گھر میں گھس آئے اور شارق کو مارنے پیٹنے لگے۔ وہ بیچارہ امتحان کی تیاری کر رہا تھا۔ جب میں نے ان سے کہا کہ میرا بیٹا بے گناہ ہے تو اس ظالم پولیس والے نے مجھے فٹ بال کی طرح لات مار کر دور گرا دیا۔ شارق سے میری یہ حالت دیکھی نہ گئی اور وہ ان کی گرفت میں اچھلنے کودنے لگا مگر ان کے شکنجوں سے آزاد نہ ہو سکا۔ میں زمین پر پڑی لاچار و بے بس ان کے ظلم کا تماشہ دیکھتی رہی اور وہ لوگ میری آنکھوں کے سامنے میرے بے گناہ بیٹے کو گرفتار کر کے لے گئے۔ تین سال ہونے کو ہیں اور وہ نہ جانے کس حالت میں جیل کی کس کوٹھری میں قید ہے؟ کوئی خبر نہیں''

''لیکن پولیس نے ایسا کیوں کیا؟''

''ان کے مطابق میرا شارق دہشت گرد ہے''

''لیکن پولیس ایسا نہیں کر سکتی۔ قانون ہے۔ عدالت ہے۔ پولیس والے کسی کو ایسے زبردستی اٹھا کر کیسے لے جا سکتے ہیں؟''

''ارے کیسا قانون؟ کیسی عدالت؟ سب برائے نام ہیں۔ آجکل کچھ بھی ممکن ہے۔ شارق کو بے گناہ ثابت کرنے کے لیے ایک وکیل کرنا تھا۔ اور آمدنی کا کوئی ذریعہ نہیں تھا۔ قانونی لڑائی تو بیٹا اجگر کی طرح پیسے نگل لیتی ہے۔ شارق دلّی کے جیل میں قید ہے اور مظفر پور سے بار ہا دلّی آنا جانا میری اوقات سے بالاتر بات تھی اس لیے میں مظفر پور کا گھر بیچ کر دلّی آ گئی۔ یہاں ایک ٹوٹا پُرانا مکان لیا۔ مگر قدرت نے یہاں بھی مجھے ایک گہرا گھاؤ دیا۔ دنگائیوں نے شارق کے بڑے بھائی کو جان سے مار ڈالا اور میں بے یار و مددگار اکیلی رہ گئی۔ اسی پر بس نہیں۔ لوگ مجھے دیکھ کر حقارت سے کہتے ہیں ''دیکھو اس بڈھی کو یہ ایک دہشت گرد کی ماں ہے!''۔ اخبارات اور ٹیلی ویژن میں بھی اسی طرح کی باتیں ہوتی ہیں۔ میں کیسے بتاؤں کہ میری زندگی میں کتنا درد ہے؟ عدالت نے کل اس

کو بے گناہ تسلیم کرلیا ہے۔ مگر اس جنگ میں تو میرا گھر بار سب کچھ لٹ گیا۔ کل شارق باعزت بری کر دیا جائے گا۔ آج تک میں اسی جگہ صبح سے شام تک مدد کے لیے ہاتھ پسارے بیٹھی رہتی تھی مگر اللہ کا شکر ہے کل سے میری زندگی میں خوشی لوٹ آئے گی۔ وہ تو میں خوش قسمت ہوں کہ میرا شارق تین سال میں رہا ہو گیا ورنہ اس ملک میں کتنی مائیں ہیں جن کو سالوں سال انتظار کرنا پڑتا ہے۔ اور کچھ مائیں تو انتظار کرتے کرتے دم توڑ دیتی ہیں۔ تم اپنی زندگی کے بارے میں کچھ بتاؤ۔ اس کے بعد تم کبھی ملنے نہیں آئے؟ اور وہ پیاری حنا کیسی ہے؟''

''میں ان سب سے بے خبر تھا۔ حنا بھی یہیں دلّی ہی میں ہے۔ کل میں بھی آپ کے ہمراہ شارق کو جیل سے لانے جاؤں گا''۔

اگلے دن اخبارات کی سرخیوں میں حیرت انگیز خبر شائع ہوئی کہ شارق پولیس انکاؤنٹر میں جان سے مارا گیا۔ انس یہ خبر سن کر فوراً پرانی دلّی گیا مگر وہاں اس کی ملاقات اس بوڑھی عورت سے نہیں ہوئی۔ لوگوں نے بتایا کہ وہ تو کل رات گھر واپس ہی نہیں آئی۔

کتنا عاشق مزاج شخص تھا شارق! اور کتنی دردناک ہے اس کی کہانی! کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ وہ ایک فرضی انکاؤنٹر میں مارا جائے گا۔ مرکزی حکومت نے اس کی تفتیش کے لیے ایک کمیٹی تشکیل کرنے کا حکم دیا ہے مگر اس کا کیا فائدہ؟ اگر یہ انکاؤنٹر فرضی ثابت ہو بھی جائے تو اب شارق تھوڑی زندہ ہو جائے گا۔

زندگی کی یہی حقیقت ہے۔ انس بے حد اداس اور ملول تھا۔ وہ آفس گیا اور کمپیوٹر پر کام کرنے لگا مگر اس کا دماغ حاضر نہیں تھا۔ وہ تو شارق کے خیال میں مستغرق تھا۔ اس کے ٹیم لیڈر نے بلا کر آخری بار متوجہ کیا کہ اگر وہ اگلے چند ہفتوں میں اچھی کارکردگی نہیں کرتا ہے تو ایسی صورت میں اس کو کمپنی سے نکال دیا جائے گا۔

"مجھے کمپنی سے کیوں نکالا جائے گا؟ اگر کمپنی کسی ملازم کو بلا کسی عذر کے نکالتی ہے تو ایسی صورت میں اس کو پراویڈینٹ فنڈ اور احتیاطی سرمایہ دینا ہوگا اور دو مہینے کی تنخواہ بھی دینی ہوگی۔قانون یہی کہتا ہے۔اسی لیے جب کسی کو نکالنا ہوتا ہے تو یہ لوگ اس کا شناختی کارڈ لے لیتے ہیں اور پندرہ دن کی پابندی عائد کردیتے ہیں۔اور پھر اس دوران یہ لوگ اس ملازم کو فرار اور بھاگا ہوا قرار دے دیتے ہیں"۔

یہ سراسر ناانصافی ہے۔ اور اس طرح کی ناانصافیوں سے دنیا بھری پڑی ہے۔شارق کی والدہ کے ساتھ جو ہوا وہ بھی ناانصافی تھی۔شارق کو تین سالوں تک قید و بند کی صعوبتیں اور پھر فرضی انکاؤنٹر میں موت بھی کوئی انصاف والی بات نہ تھی۔ دنیا سے انصاف عنقا ہو چکا ہے۔آخر اس کی بنیاد اور جڑ کیا ہے؟ دنیا میں ہر طرف نفرت، حسد اور ظلم و جبر کا بول بالا ہے اور ان سب کے شکار صرف بے گناہ لوگ ہیں۔

اخبار کی سرخی دیکھ کر انس کی آنکھیں بھیگ گئیں۔ بے اختیار اس کے آنسو بہہ نکلے۔اس کو غمگین پا کر حنا اس کے پاس آئی اور اداسی کا سبب معلوم کیا۔اخبار کی سرخی دیکھ کر حنا کا دل بھی اداس ہوگیا۔اس کو کالج کے دن یاد آ گئے۔وہ کہنے لگی کہ شارق کتنا عاشق مزاج اور خوش اخلاق تھا۔ وہ اپنی مدھ بھری آواز سے غزلیں سنا کر ہم سب کا دل جیت لیتا تھا۔لیکن افسوس آج وہ آواز ہمیشہ کے لیے خاموش ہوگئی۔ کیوں یہ دنیا پیار اور اس طرح کے پیارے لوگوں کے خلاف ہے؟ شارق کا گناہ کیا تھا؟ اور اس جیسے ہزاروں لوگوں کا کیا جرم ہے جو سزائے بے گناہی کے شکار ہیں؟ کیا خدا ہی ناانصاف ہے؟ نہیں نہیں۔خدا ناانصاف ہو ہی نہیں سکتا۔

خدا کا شکر ہے کہ ہماری زندگی پرامن ہے۔اب مجھے اپنے بچوں کے مستقبل کی بے حد فکر ہے۔انس کو ایک مرتبہ پھر شارق کی والدہ کی یاد آ گئی۔وہ کہاں ہو سکتی ہیں؟ اپنے بیٹے

کی رہائی کی کتنی امید تھی ان کو۔اور بدلے میں کیا ملا۔شارق کی والدہ کے بارے میں سوچ کر انس کو اپنی والدہ کی یاد آ گئی۔اس لیے انس نے اپنی اماں سے فون پر بات چیت کی۔اس کی امی اس سے بات کر کے بے حد خوش ہوئی مگر رضا قدرے ناراض تھا۔رانی نے انس سے گاہے بگاہے فون کرنے کہا کیوں کہ اس سے اس کو خوشی حاصل ہوتی ہے۔آج کا دن انس اور حنا کے لیے نہایت افسوسناک تھا۔شارق کی خبر سن کر دونوں کا دل ماضی کو یاد کر کے تڑپنے لگا۔رانی آج میعادی جانچ کے لیے ڈاکٹر کے پاس جانے والی تھی۔ جانکاہ کھانسی کے علاوہ اس کو اور کوئی تکلیف نہ تھی۔انس بھی واقف تھا کہ آج اس کی والدہ ڈاکٹر سے ملنے کے لیے پٹنہ جا رہی ہیں۔رانی پٹنہ روانگی سے قبل اپنے والدین سے ملنے گئی۔

☆☆☆

آخری باب

رضا اور رانی اسپتال میں تھے۔ڈاکٹر نے انہیں مخصوص جانچ کرانے کی صلاح دی۔ان کے پاس پیسے کم تھے مگر حوصلے کی بالکل کمی نہ تھی۔ٹیسٹ کرانے کے بعد ایک ڈاکٹر نے ان کو ویٹنگ ہال میں بیٹھ کر رپورٹ کا انتظار کرنے کا حکم دیا۔

''لوگ اپنے بال بچوں کی پرورش کس دن کے لیے کرتے ہیں؟ تا کہ بچے بڑھاپے میں ان کا سہارا بنیں۔ لیکن ہمارے اکلوتے بیٹے کو ہماری فکر بالکل نہیں ہے۔''

رضا بولتا رہا اور رانی کو نیند آ گئی۔ جب رضا کو احساس ہوا کہ رانی اس کی باتیں نہیں سن رہی ہیں اس نے کہنیوں سے ہلا کر اس کو بیدا کر دیا۔

''آپ اپنے ذہن سے یہ خیال نکال دیں۔آپ دیکھیے گا ایک نہ ایک دن وہ پروفیسر بنے گا اور پھر اس کے پاس وقت اور پیسے کی بہتات ہوگی۔ ہمارا انتظار رائیگاں نہیں جائے گا''۔

''مجھے تو ایسا نہیں لگتا۔ مجھے لگتا ہے وہ ہمیں بھول کر اپنی بیوی بچے کی دنیا میں مست ہو گیا ہے۔اس کی زندگی میں اس کے پاس سب کچھ ہے۔اب اس کو اپنے بوڑھے ماں باپ کی ضرورت ہی کیا ہے؟ ہم لوگ تو اس کے لیے بس ایک بوجھ ہیں'' رضا نے اس کو اپنی

بات باور کرانے کی کوشش کی مگر رانی نے یکسر انکار کر دیا۔ اگرچہ جواب میں وہ کچھ بول نہ سکی مگر اپنی گردن نفی میں ہلا کر اس نے رضا کی باتوں سے بیزاری کا اظہار کیا۔ اسی دوران ایک ڈاکٹر نے رپورٹ دینے کے لیے رانی کا نام پکارا۔ رضا فوراً ڈاکٹر کے روم میں گیا۔

''ڈاکٹر صاحب! سب ٹھیک تو ہے نا؟''

''نہیں، بالکل نہیں۔ دراصل ایک دفعہ پھر اس کو ٹی بی کی بیماری نے ہولیا''۔

''کیا؟ ٹی بی دوبارہ بھی ہو سکتا ہے؟''

''جی ہاں! ٹی بی دوبارہ ہو سکتا ہے۔ اور جب یہ بیماری دوسری مرتبہ کسی کو ہوتی ہے تو صحت یاب ہونے کا امکان گھٹ جاتا ہے''۔

''اس کا کیا مطلب ہے؟''

''اب کیا کریں؟''

''کچھ نہیں۔۔۔۔اب وہ کب تک زندہ رہے گی یہ تو بس بھگوان ہی بتا سکتے ہیں''

یہ سن کر رضا سر پکڑ کے زمین پر بیٹھ گیا۔ آنکھوں سے چشمے نکالے اور آنسو پوچھنے لگا۔ اس نے اپنی جیب سے موبائل نکال کر اپنے بیٹے انس کا نمبر ڈائل کیا مگر پھر اس نے بغیر بات کیے موبائل جیب میں واپس رکھ دیا۔ جب وہ رانی کے پاس آیا تو پہلے تو اس نے حقیقت چھپانے کی کوشش کی مگر اس کی آنکھوں سے حقیقت عیاں ہو گئی۔

انس آفس میں تھا۔ ایک بار پھر اس کا لیڈر اس کے کام سے مطمئن نہیں تھا۔ آج انس کو اپنے وطن کی یاد بے حد ستا رہی تھی۔ اس کے لیڈر نے اس کو خوب ڈانٹا پھٹکارا اور کہا کہ اس کی کارکردگی اگر ایسی ہی رہی تو دوبارہ کمپنی آنے کی ضرورت نہیں ہے۔ اس وقت اس کو ہلکی سی خوشی بھی محسوس ہوئی کیوں کہ اگلے دن ہفتے کی چھٹی تھی اور اس کے سابق باس نے اس کو ڈِنر پر مدعو کیا تھا۔ وقفے کے دوران اس نے فون کر کے اپنی امی کی

خیرت لینی چاہی۔ جب اس نے فون کیا تو دوسری جانب سے اس کے ابا کے رونے کی آواز آئی۔

''تمہاری امی پٹنہ اسپتال میں ہے۔ ڈاکٹر نے کہا ہے کہ اس کی صحت یابی کا امکان بالکل کم ہے۔ اس لیے جتنی جلد ممکن ہو تم گھر آ جاؤ''۔

انس پہلے ہی رنجیدہ خاطر تھا۔ یہ خبر سن کر اس کی اداسی میں مزید اضافہ ہو گیا۔ باس کے گھر پہنچتے ہی اس نے ٹکٹ بک کرانے کے لیے کال پہ کال کرنا شروع کر دیا۔ مگر انڈین ریلوے میں ٹکٹ بک کرانا کوئی آسان کام نہیں ہے۔ آخر کار اس کا ایک دوست جو ریلوے کا کام کاج کرتا تھا کسی طرح اس نے اگلے دن کے لیے گرمی کے موسم میں چلنے والی ایک مخصوص ٹرین میں انس کا ٹکٹ بک کرا دیا۔

اگلے دن صبح سویرے موبائل کی گھنٹی بجی حنا نے فون اٹھایا۔ انس بستر سے اٹھ کر دوڑ پڑا اور حنا کے ہاتھ سے موبائل چھین لیا۔ وہ اپنی امی سے بات کرنا چاہتا تھا۔ رضا نے رانی کو فون دیا۔ وہ اپنے لاڈلے سے ڈھیر ساری باتیں کرنا چاہتی تھی مگر وہ اتنا ہی کہہ سکی ''بعد میں بات کروں گی۔۔۔۔ بعد میں بتاؤں گی''۔

رضا نے فون اپنے ہاتھ میں لیا اور انس کو اطلاع دی کہ اس کی والدہ کی حالت بہت نازک ہے۔ ایک گھنٹہ کے بعد پھر فون آیا۔ رضا نے انس سے کہا کہ اب پٹنہ آنے کی ضرورت نہیں ہے۔ ہم لوگ اب گھر لوٹ رہے ہیں۔ انس بات سمجھ گیا اور زار و قطار رونے لگا۔ حنا نے اس کے ہاتھ سے فون چھین لیا اور رانی کی وفات کی تصدیق ہو گئی۔

ٹرین صبح نو بجے دہلی سے روانہ ہوئی اور دوسری رات کے ایک بجے مظفر پور پہنچی۔

والدہ کے بعد انس کے لیے یہ دنیا گوشۂ تنہائی بن کر رہ گئی۔ رانی کے انتقال کو ابھی ایک سال بھی پورے نہیں ہوئے تھے کہ رضا نے دوسرا نکاح کر لیا۔ اس کی دوسری بیوی ایک

بیوہ عورت تھی۔ اس نے اپنے بیٹے انس کو اپنے نکاحِ ثانی کے بارے میں بھی نہیں بتایا۔ اب تو رضا نے انس کا فون تک اٹھانا بند کر دیا تھا۔

پانچ سال بعد انس کی تعلیم مکمل ہو گئی مگر اچھے دن کا خواب اب تک تشنۂ تعبیر تھا۔ انس ابھی تک بے روزگار تھا۔ چوں کہ انس کی والدہ اس کے والد کے حیات میں ہی انتقال کر چکی تھی اس لیے شریعتِ اسلامی کے مطابق انس اپنے نانا کی جائیداد و ملکیت میں وراثت کا حقدار نہیں تھا۔

اب انس ہی رانی کا اکلوتا چشم و چراغ تھا۔ اگر چہ اب وہ خود صاحب آل اولاد تھا مگر والدہ کی وفات اسے تنہا کر گئی تھی۔ اس کے والد جیتے جی اس کی نظر میں مر چکے تھے۔ اپنے اندر غم واندوہ کی ایک کائنات لیے ہوئے وہ زندگی سے لڑتا رہا۔ ایک دن انس کہیں سے گزر رہا تھا کہ اچانک اس کی نگاہ ایک سائن بورڈ پر پڑی جہاں لکھا تھا **"دو بوند انسداد پولیو کے لیے"** یہ دیکھ کر انس مسکرایا اور ایک نامعلوم منزل کی طرف چلا گیا۔

☆☆☆

وسیم احمد علیمی کی دیگر شائع شدہ کتابیں

1. پلاسٹک کی قبر (افسانوی مجموعہ)

2. کلیاتِ ادب (تاریخ ادب اردو)

3. آزادی اور آلو فرائی (عربی کہانیوں کا ترجمہ)

SHABE INTEZAR GUZRI HAI

(Novel)

by : DR ANWARUL HAQUE

Translated by

WASIM AHMAD ALIMI

عزیزی وسیم احمد علیمی کو میں پہلے سے نہیں جانتا تھا۔ جب یہ ایم۔اے۔ کے پہلے سمیسٹر میں اختیاری پرچہ 'ترجمہ نگاری' (Translation) کی میری کلاس میں آئے تو ان سے تعارف ہوا۔ میں نے انہیں عام طلباء جیسا ہی سمجھا۔ طلبا عموماً اختیاری پرچے کے انتخاب میں زیادہ مغز نہیں کھپاتے بلکہ یونہی لے لیتے ہیں۔ لیکن عزیز موصوف کی گفتگو سے اندازہ ہونے لگا کہ ان کے یہاں معاملہ تھوڑا سنجیدہ گی سے بھرا ہے۔ پھر عقدہ کھلا کہ یہاں تو معاملہ اس سے بھی آگے کا ہے۔ یہ حضرت اپنی دیگر علمی لیاقت کے ساتھ ساتھ شعبۂ انگریزی، جامعہ ملیہ اسلامیہ سے ترجمہ نگاری کا باضابطہ کورس کر کے میرے پاس پہنچے ہیں اور کچھ انگریزی تحریروں کے ترجموں کے علاوہ ڈاکٹر انورالحق کے انگریزی ناول The Long Wait کو اردو میں منتقل کر چکے ہیں جس کی اشاعت کے لیے حکومت بہار کے اردو ڈائرکٹوریٹ سے مالی تعاون کی منظوری مل چکی ہے، جس کے ضابطہ کی چھ مہینے کی مدت پوری ہونے کو ہے۔

ڈاکٹر انوارالحق کا انگریزی ناول قارئین کے Domain میں ہے اور اس کا اردو ترجمہ بھی تیار ہے اور جلد ہی زیور طباعت سے آراستہ ہوکر منظر عام پر آجائے گا۔ ڈاکٹر انوارالحق بھی مجھے عزیز ہیں، ان کی صلاحیتوں کا معترف ہوں، طرفداری کے خوف سے ان کے ناول اور اس ترجمہ پر اپنی کوئی رائے نہیں دے رہا ہوں۔ بہر حال اس کا فیصلہ باذوق قارئین کریں گے ہی۔ ویسے اطلاعاً عرض ہے کہ اس ناول کا اڑیا زبان میں ترجمہ ہو چکا ہے۔

امید ہے کہ عرض مترجم کے تحت عزیزی وسیم احمد علیمی ناول پر اور اپنے ترجمہ کے متعلق قدرے تفصیل سے اظہارِ خیال کریں گے۔ یہ مختصر سی تحریر بطور دعا ہے کہ اللہ پاک عزیز موصوف کی لگن، دلجمعی اور محنتِ شاقہ کو حق لگائے اور ان کے مستقبل کو تابناک کرے۔ (آمین)

ڈاکٹر سید تنویر حسین
شعبۂ اردو
جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی

EDUCATIONAL
PUBLISHING HOUSE
New Delhi , INDIA

ISBN 978-93-88356-37-4
978-93-88356-37-4
www.ephbooks.com

4th Updated and
Enlarged Edition-2025

1500 Copies Sold so far

کُلّیاتِ ادب

(یو.جی.سی۔نیٹ۔جے آر ایف کے نصاب پر مشتمل اردو کی ایک معتبر کتاب)

وسیم احمد علیمی

Entirely Based on the Complete Syllabus of

NTA-UGC-NET/JRF-(Urdu)

پلاسٹک کی قبر

(افسانے)

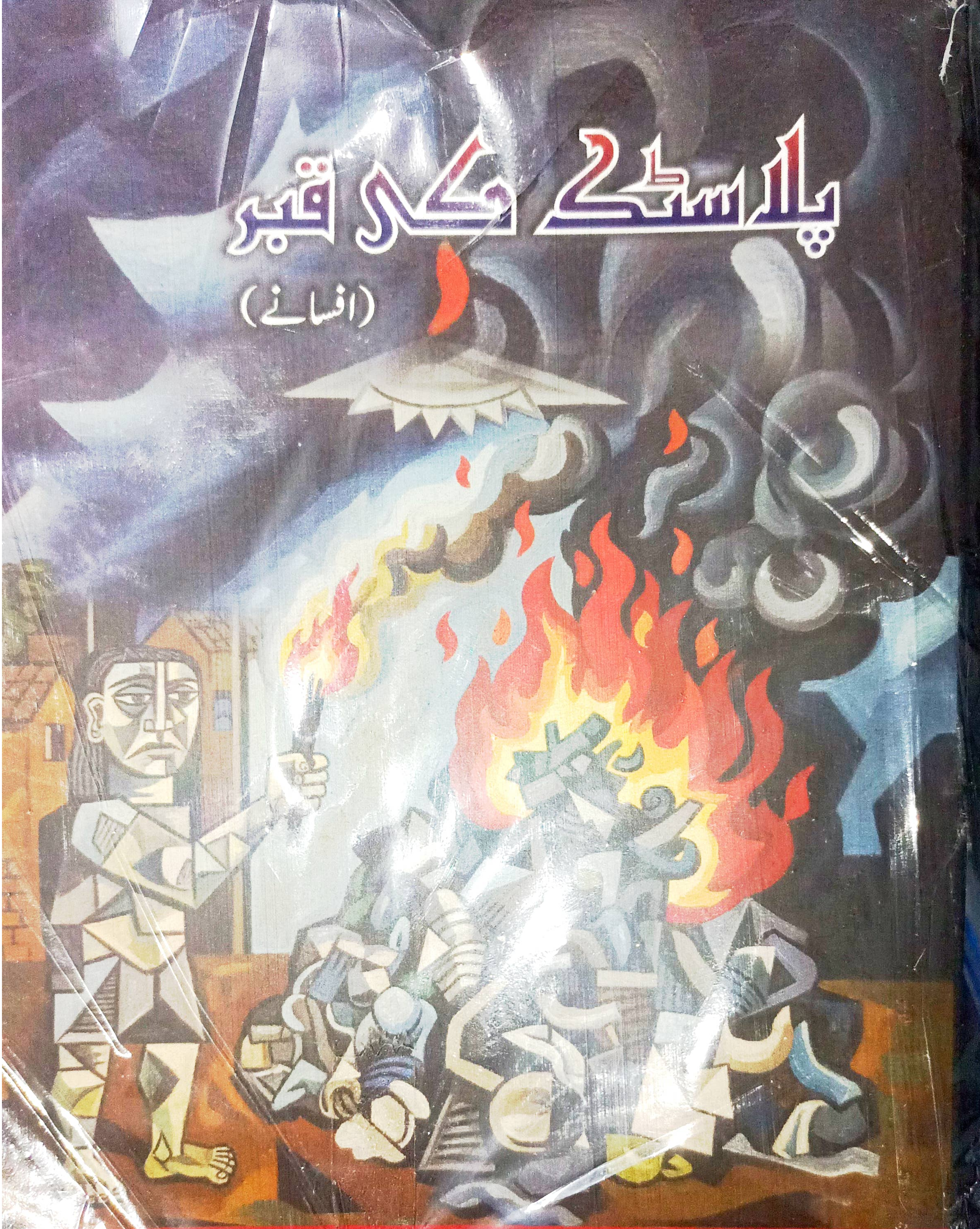

وسیم احمد علیمی

آزادی اور آلو فرائی

(مشرق وسطیٰ کی جنگ اور بدامنی پر مشتمل شامی نژاد تخلیق کار کے تین افسانوی مجموعے)

افسانہ نگار

لؤی علی خلیل

عربی سے ترجمہ

وسیم احمد علیمی